خواب زندگی ہوتے ہیں

خواب دیکھیے ۔ضرور دیکھیے ۔خواب زندگی ہوتے ہیں مگر......مگر کو ابھی چھوڑیے۔اس پر بعد میں بات کریں گے۔ابھی خواب پر بات کرتے ہیں۔

خواب انسان کی عظمت ہے کہ ہر سر بلندی کا پہلا قدم خواب ہوتا ہے۔انسان بڑا نہیں ہوتا، اسے اس کے خواب بڑا بناتے ہیں۔سو خواب دیکھنے چاہیے۔ بڑے خواب دیکھنے چاہیے۔تو پھر بڑا خواب کیا ہے؟ بنگلہ، گاڑی، شوہر، بیوی ، بچے ،عزت ،شہرت، دولت ۔ یہی ہمارے خواب ہیں۔مگر یہ بڑے خواب کیا ہوں گے، یہ تو خواب ہی نہیں۔ یہ تو مقدر ہے جو نادان خواب میں دیکھتے ہیں۔مقدر تو جتنا لکھا ہے، جب لکھا ہے مل ہی جائے گا۔پھر ایک روز اچانک پتہ چلے گا کہ یہ زندگی ہی خواب تھی۔ ’خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا‘

فانی انسان کو تو ابدی خواب دیکھنے چاہییں۔ ابدی زندگی کے دیکھنے چاہییں۔ ان خوابوں میں مالک ذوالجلال کے قدموں کی دھوون میں اپنا کوئی مقام دیکھنا چاہیے ۔سات آسمانوں کی بادشاہی میں اپنا حصہ دیکھنا چاہیے۔انبیائے کرام کی مجلسوں کی رفاقت دیکھنی چاہیے۔وہ محفلیں دیکھنی چاہییں جہاں فانی انسان چشمہ ابدیت کے کنارے بیٹھ کر عنایت خسروی کے جام پیے گا۔ جہاں حسن ولذت کی ہر حکایت اپنا کمال دیکھے گی۔ جہاں رنگ ونور کی برسات نگاہوں کو منور، نغمہ وآہنگ کا جادو سماعتوں کو مترنم اور بوئے گل کا اعجاز مشام جاں کو معطر کر دے گا۔

یہی خواب ہیں۔صرف یہی خواب ہیں۔ باقی سراب ہے۔سو خواب دیکھیے ۔اس لیے کہ یہی خواب زندگی ہیں مگر......خواب ہی دیکھتے رہنا موت ہے۔خواب کو دیکھنے کے بعد تعصب کو سولی دینی پڑتی ہے۔خواہش کو مٹانا اور انا کو فنا کرنا پڑتا ہے۔شاید اسی لیے لوگ یہ خواب نہیں دیکھتے۔مگر ایک فقیر بے نوا کے کہنے سے ہی سہی......خواب ضرور دیکھیے ۔خواب زندگی ہوتے ہیں۔

مجرم اور محبوب

عارف کی مجلس میں موجود کسی شخص کا یہ ایک تحریری سوال تھا۔ عارف نے بلند آواز سے سوال پڑھنا شروع کیا: ''جناب آپ جانتے ہیں کہ ہمارے معاشرے نے شادی کو بہت مہنگا اور مشکل جبکہ زنا کو بہت سستا اور ہماری دسترس میں کر دیا ہے۔ میں ایک غیر شادی شدہ نوجوان ہوں۔ غیر محرم خواتین سے بدنگاہی معمول بن چکا ہے۔ انٹرنیٹ اور موبائل پر غیر اخلاقی چیزیں بھی دیکھنا معمول میں شامل ہے۔ اسے برا سمجھتا ہوں، مگر خود پر قابو نہیں رہتا۔ کیا کروں؟''

''اپنی کمزوری کو اپنی طاقت بنالیں۔''، عارف نے سوال ختم کر کے بغیر کسی توقف کے جواب دینا شروع کر دیا۔ لوگ ہمہ تن گوش ہو گئے۔ وہ جانتے تھے کہ اب معرفت کا دریا بہنا شروع ہو چکا ہے۔ عارف بولتے رہے:

''جذبہ ہمیشہ عقل پر غالب آجاتا ہے۔ یہ انسان کی کمزوری ہے۔ انسان جذبات کی رو میں بہہ کر غلط کام کر جاتا ہے۔ جذبہ پہاڑی دریا ہے۔ آپ اس کو نہیں تھام سکتے ہیں۔ ہاں اس کا رخ موڑ سکتے ہیں۔ یہی آپ کی طاقت ہے۔ یہی کمزوری آپ کی سب سے بڑی طاقت ہے۔''

عارف نے آخری جملے پر خاص طور پر بہت زور دیا تھا۔

''ان جذبوں میں دو جذبے شدید ترین ہوتے ہیں۔ غصہ اور جنسی خواہش۔ یہ جس وقت ابھرتے ہیں ہر دیوار گرا دیتے ہیں۔ کوئی بند دروازہ ان کی راہ نہیں روک سکتا۔ یہ ہر دروازہ توڑ دیتے ہیں، مگر''، اس مگر کے بعد لمحے بھر کا وقفہ آیا۔ وہ پھر گویا ہوئے۔

''مگر دیوار گرنے اور دروازہ ٹوٹنے سے پہلے یا ذرا بعد ایک لمحہ آتا ہے...... لازمی طور پر آتا ہے۔ اس لمحے میں دل کی گہرائیوں سے اللہ کو پکاریے۔ اسے بتائیے کہ آپ کیا چاہتے ہیں۔ یہ بتائیے کہ کیا نہیں چاہتے۔ عام حالات میں بھی اللہ آپ کی پکار سنتے ہیں۔ مگر آپ کی وش لسٹ

زمین سے آسمان اور آسمان سے عرش تک پھیلے نجانے کتنے فرشتوں سے گزر کر در قبولیت کے سامنے پہنچتی ہے۔ مگر اس لمحے میں آپ کا جذبہ آپ کی پکار میں اتنی تڑپ پیدا کر دیتا ہے کہ یہ پکار ہر دیوار ڈھاتی ہوئی اور ہر دروازہ توڑتی ہوئی سیدھی عرش تک جا پہنچتی ہے۔

پھر در قبولیت بلا تاخیر کھلتا ہے۔ سب سے پہلے شیطان کے ڈنک کو نکال کر سینے کی جلن کو ٹھنڈک سے بدل دیا جاتا ہے۔ پہلے صبر دیا جاتا ہے۔ پھر زیادہ وقت نہیں گزرتا کہ نعمتیں دے کر شکر کے اسباب پیدا کر دیے جاتے ہیں۔

یاد رکھیے۔ شیطان جذبات کو جال بنا کر آپ کو پھانستا ہے۔ مگر جو یہ فقیر بتا رہا ہے وہ کر لیجیے۔ شیطان کا داؤں اسی پر الٹ جائے گا۔ وہ آپ کو مجرم بنا رہا تھا۔ آپ محبوب بن گئے۔ وہ محروم کر رہا تھا مگر آپ کو دنیا و آخرت میں وہ سب کچھ دے دیا جائے گا جو آپ کے خوابوں سے زیادہ ہو گا۔ جذبہ آپ کی کمزوری ہے۔ اسے اپنی قوت بنا لیجے۔''

عارف کی بات ختم ہو گئی۔ مگر ان کے الفاظ کی گونج نے ہر خانہ دل کو اس رب کی محبت سے معمور کر دیا تھا جو سراپا شفقت ہے اور جس کی عنایتیں کبھی ختم نہیں ہوتیں۔

اپنا نقطہ نظر

دورِ جدید میں مسلمانوں کی تربیت میں یہ بات شامل ہوچکی ہے کہ اس دنیا میں دو نقطہ نظر ہوتے ہیں۔ ایک اپنا نقطہ نظر اور دوسرا غلط نقطہ نظر۔ اس تربیت کا نتیجہ یہ ہے کہ کوئی شخص کسی دوسرے کی بات کو سننے، سنجیدگی سے لینے، اس کے دلائل پر غور کرنے، اپنی غلطی کو ماننے، حتیٰ کہ اپنی غلطی کے امکان کو تسلیم کرنے کے لیے بھی تیار نہیں ہے۔

پوری ڈھٹائی کے ساتھ اپنی بات پر جمے رہنے کا سبب صرف یہی نہیں کہ انسان دوسروں کی بات سنتا نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ اسے پہلے دن سے یقین دلا دیا جاتا ہے کہ تم ہی ٹھیک ہو اور باقی سب غلط ہیں۔ حالانکہ اکثر ایسے لوگوں کا علم بالکل معمولی ہوتا ہے۔ وہ علم و تحقیق کی روایت سے سرے سے واقف ہی نہیں ہوتے۔ وہ زمینی حقائق سے آخری درجے میں لاعلم ہوتے ہیں۔ ان کا کل سرمایہ جہالت پر مبنی اعتماد ہوتا ہے۔

اس انداز فکر میں سکون تو بہت ہے کہ انسان اپنی بات کی کمزوری سامنے آنے پر جس اذیت کا شکار ہوجاتا ہے، غلطی نہ مان کر انسان اس سے جان چھڑا کا لیتا ہے۔ مگر اس سطحی اور وقتی سکون کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ انسان نہ صرف سچائی سے محروم ہوجاتا ہے بلکہ اپنی غلطی کی اصلاح کے بعد دنیا میں ترقی اور اللہ کی قربت حاصل کرنے کا جو عظیم موقع مل سکتا تھا، وہ اسے کھو دیتا ہے۔ اپنی غلطی مان لینے کے بعد وقتی تکلیف ہوتی ہے، مگر اس کے بعد جو کچھ حاصل ہوتا ہے وہ ایسی روحانی اور فکری ترقی ہوتی ہے کہ اس کی سرشاری زندگی بھر نہیں جاتی۔ مگر بدقسمتی سے لوگ اپنے تعصّبات کے پیچھے اس طرح اندھے ہوتے ہیں کہ وہ ہمیشہ لذت اعتراف سے محروم رہتے ہیں۔

اعتراف خدا کی دنیا میں لامحدود ترقی کا راستہ ہے۔ مگر ایک متعصب اور ڈھیٹ آدمی یہ موقع ہمیشہ کے لیے کھو دیتا ہے۔

شیخ صاحب نماز کیا جانیں

مراز داغ دہلوی (1831-1905) کلاسیکل اردو شاعری کے دور متاخرین کا نمایاں ترین نام ہیں۔ وہ غالب اور میر کی طرح اردو غزل کے اصل امام تو نہیں ہیں، مگر جذبات، بیان اور احساس کی وہ ساری خوبیاں ان کی شاعری میں جمع ہیں جو انھیں اپنے دور کا بہت بڑا شاعر بناتی ہیں۔ ان کی عظمت یہ ہے کہ اقبال جیسے لوگ ان سے اصلاح لیتے تھے۔

اردو شاعری کو داغ نے متعدد شاندار غزلیں دیں۔ ان کی ایک بہت خوبصورت اور مشہور غزل کا مقطع اردو زبان وادب کے کس طالب علم کو یاد نہ ہوگا۔

جو گزرتے ہیں داغؔ پر صدمے

آپ بندہ نواز کیا جانیں

اس غزل کا ایک اور شعر اس طرح ہے:

کب کسی در کی جبہ سائی کی

شیخ صاحب نماز کیا جانیں

یہ شعر بظاہر ایک دنیادار شاعر کا اہل مذہب پر ایک طنز ہے، مگر یہ نماز کی حقیقت کو جتنی خوبی سے بیان کرتا ہے بڑا سے بڑا عالمانہ خطبہ بھی یہ کام نہیں کرتا۔ شعر کا سادہ ترین مطلب یہ ہے کہ مذہب کی نمائندگی کرنے والے شیخ صاحب نماز کی حقیقت نہیں سمجھ سکتے کیونکہ انھوں نے کبھی کسی اور در کے سامنے ماتھا ہی نہیں ٹیکا۔

بظاہر یہ ایک نامعقول اور کسی قدر گستاخانہ بات لگتی ہے کہ کسی نمازی کی نماز پر اس طرح طنز کیا جائے کہ اس نے کبھی کسی اور کے سامنے تو ماتھا ہی نہیں رگڑا تو وہ نماز کو کیا جانے گا۔ مگر درحقیقت یہ شعر کمال خوبی سے اس بات کو بیان کرتا ہے کہ عام نمازیوں کی نماز میں کوئی کیفیت،

کوئی زندگی اور جذبات کی کوئی گرمی اس لیے نہیں ہوتی کہ ان کی نماز ایک یکطرفہ عمل ہوتی ہے۔

جبکہ اپنی حقیقت کی لحاظ سے نماز ایک دوطرفہ عمل ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ جب کوئی شخص کسی بادشاہ یا بڑے آدمی کے سامنے جا کر اس کے سامنے پیشانی رگڑنا شروع ہو جاتا ہے تو یہ نفسیاتی سطح پر اس کے لیے بہت بڑا واقعہ ہوتا ہے۔ اسے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کسی زندہ اور باشعور ہستی کے سامنے سر جھکا رہا ہے اور پیشانی ڈال رہا ہے۔ آدمی یہ کام عام حالات میں کرتا ہے نہ عام لوگوں کے سامنے کرتا ہے۔ وہ بڑی بے کسی اور بے بسی میں مبتلا ہو کر جب کسی بادشاہ کے حضور پیش ہوتا ہے تو اپنی تڑپ کے اظہار کے لیے اس کے قدموں میں گر جاتا ہے۔ کسی کے سامنے پیشانی ٹیکنا اتنا بڑا عمل ہے یہ عمل انسان اگر کسی بت کے سامنے بھی کرے تو اسے یہ احساس ہوتا ہے اس نے اپنا سب کچھ کسی کے قدموں میں لا ڈالا ہے۔

اس کے برعکس بدقسمتی سے عام نمازی خدا کے سامنے ایسے نماز پڑھتے ہیں کہ گویا وہ تنہا کھڑے ہیں اور سامنے کوئی ہے ہی نہیں۔ یہ نماز ایک رسم اور ایک عادت کے سوا کچھ نہیں ہوتی۔ مگر درحقیقت نماز جن اعمال کا مجموعہ ہے ان کی حقیقت کو اسی وقت سمجھا جا سکتا ہے جب وہ کسی اور کے سامنے کیے جائیں۔ کسی کے سامنے سر جھکانا، ہاتھ باندھ کر کھڑا ہوا، دوزانو ادب سے بیٹھ جانا، کمر کے بل جھک جانا اور سب سے بڑھ اس کے سامنے ماتھا رگڑنا تعظیم اور عاجزی کی انتہا ہوتی ہے۔ یہ کسی در سے گہری عقیدت، محبت اور اپنی مجبوری اور بے بسی کے بیان کی آخری شکلیں ہوتی ہیں۔ مگر ہم سب یہ کام اللہ تعالیٰ کے سامنے ایسے کرتے ہیں کہ ہماری روح اندر سے ہر احساس سے خالی ہوتی ہے۔ ہماری نفسیات پر اس نماز کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ اسی لیے داغ کا یہ شعر ہم سب کے بارے میں ٹھیک ہے۔

کب کسی در کی جبہ سائی کی

شیخ صاحب نماز کیا جانیں

محبت اور خوف

مجھ سے بارہا ایک سوال یہ کیا جاتا ہے کہ انسان کے لیے اچھے اعمال کا محرک کیا ہونا چاہیے......اللہ کا خوف یا اللہ کی محبت۔ میں اس بات کا ہمیشہ قرآن مجید اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ جو کہ قرآن مجید ہی کی عملی شکل ہے، کی روشنی میں یہ جواب دیتا ہوں کہ دونوں ہی ضروری ہے۔خرابی اس وقت پیدا ہوتی ہے جب ہر موقع بے موقع اللہ سے ڈرایا جاتا رہے یا ہمہ محبت اور شوق کی بات کر کے خوف خدا سے لوگوں کو بے نیاز کر دیا جائے۔

قرآن مجید اس معاملے میں بالکل واضح ہے کہ بندوں کو رب سے تعلق دونوں پہلوؤں سے ہونا چاہیے۔ چنانچہ جگہ جگہ قرآن مجید میں ''خوف وطمع کے ساتھ اسے پکارو'' جیسی تعبیرات استعمال ہوئی ہیں۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بشیر یعنی خوشخبری دینے والا اور نذیر یعنی خبر دار کرنے والا قرار دیا گیا ہے۔ جنت کے ذکر سے بھی قرآن مجید بھرا ہوا ہے اور جہنم کے عذابوں کا ذکر بھی کم نہیں ہے۔سب سے بڑھ کر اللہ سے محبت بھی اہل ایمان کا وصف بیان ہوا ہے اور بن دیکھے ڈرتے واہنے والے بھی ان کی صفت بیان ہوئی ہے۔

ان دونوں چیزوں کو ساتھ ساتھ بیان کرنے کی وجہ یہ ہے کہ ایک انسان پر زندگی میں دونوں طرح کے لمحات آتے ہیں۔ اسے نیکیوں کی طرف رغبت بھی ہوتی ہے۔شکر گزاری اور احسان مندی کے جذبات بھی جنم لیتے ہیں۔ساتھ میں غفلت وفراموشی کی کیفیت بھی طاری ہوتی ہے۔ شہوت اور غضب بھی انسان پر سوار ہوتے ہیں۔پہلی صورت میں بشارت اور رحمت کی نوید اس کا حوصلہ بڑھاتی ہے اور دوسری صورت میں نار جہنم کے شعلے اسے واپس راہ راست پر لاتے ہیں۔ چنانچہ قرآن مجید کے بیانات نفسیات انسان کا مکمل جواب ہیں۔

خرابی اصل میں اس وقت پیدا ہوتی ہے جب کوئی مصلح قرآن مجید کو معیار بنانے کے بجائے

اپنے ذوق، طبیعت اور مزاج کو بنیاد بنا کر دین کو بیان کرنا شروع کر دیتا ہے۔اس کا مزاج شدت پسند ہو تو وہ لوگوں کی ہر غلطی کا ذکر سنتے ہی اپنی زبان سے نار جہنم کے شعلے برسانا شروع کر دیتا ہے۔وہ چھٹانک بھر غلطی کو اٹھاتا ہے اور منوں وزنی جرائم سے متعلق سزا سنا دیتا ہے۔ وہ سد ذریعہ کی نوعیت کے حکم کو لیتا ہے اور اسے ایسے پیش کرتا ہے گویا اسے چھوڑا تو انسان دین کے دائرے سے باہر نکل جائے گا۔

مزاج سہولت پسند ہو تو غفلت و معصیت کی ہر قسم پر بھی ''اللہ معاف کرنے والا'' کہہ کر ایسے رعایت دی جاتی ہے کہ توبہ اور اصلاح کا کوئی خیال ذہن میں نہیں آتا۔اللہ اور اس کے رسول کی محبت کے ایسے فضائل سنائے جاتے ہیں کہ انسان عمل صالح کی تمام اقسام سے خود کو فارغ سمجھتا ہے۔بندوں کے حقوق کی ایسی دہائی دی جاتی ہے کہ نماز روزہ دین سے خارج محسوس ہوتے ہیں۔ظاہر ہے کہ یہ ایک دوسری انتہا ہے اور پہلی کی طرح ہی غیر مطلوب ہے۔

بندہ مومن خوف و امید دونوں میں جیتا ہے۔اس کی امید ایسی ہوتی ہے کہ اگر کائنات میں سے صرف ایک شخص کی معافی کی گنجائش ہو تو اللہ کی رحمت سے وہ خود ہی کو اس کا حقدار سمجھتا ہے اور خوف ایسا ہوتا ہے کہ اگر ایک ہی شخص کے جہنم رسید ہونے کا اعلان کر دیا جائے تو وہ ڈرتا ہے کہ یہ شخص کہیں وہی نہ ہو۔

تاہم عملی طور پر اس میں سب سے اچھی راہ یہ ہے کہ انسان ہر عمل کرنے سے پہلے خوف و اندیشہ میں جیے اور پوری قوت سے بہترین عمل کرنے کی کوشش کرے۔ جب بہترین کوشش کر لے تو اللہ پر بھروسہ رکھے کہ اس سے بڑھ کر عالی ظرف اور رحمدل ہستی کوئی نہیں۔وہ چھوٹے سے چھوٹے عمل کا بدلہ پہاڑ کے برابر دینے والا ہے۔یہ امید اور اندیشہ اور خوف و رجاء ایمان میں وہ حسن پیدا کرتا ہے جو اللہ کو مطلوب ہے۔

اختلاف رائے کے آداب

اس دنیا میں انسان ایمان وفکر کے جس امتحان میں ہے اس میں یہ لازمی ہے کہ لوگوں میں اختلاف رائے رونما ہوگا۔ یہ اختلاف ہر مذہبی اور غیر مذہبی معاملے میں ہوگا۔ ایسے میں چند آداب ہیں جن کا ابتدائی شعور بھی ہمارے ہاں لوگوں کو نہیں ہے۔ جس کے نتیجے میں لوگ سنگین نوعیت کے اخلاقی جرائم کے مرتکب ہوتے ہیں۔ ان کا جاننا ہم سب کے لیے ضروری ہے۔

پہلی چیز یہ ہے کہ لوگ اختلاف رائے کے وقت فوراً سے پیشتر کسی بھی شخص کی نیت، عمل کے محرکات، ایمان، اخلاص اور قلبی کیفیات کے بارے میں گفتگو شروع کر دیتے ہیں۔ اس کی وجہ جو بھی ہو یہ اخلاقی اعتبار سے بدترین جرم ہے۔ اس کی سنگینی کا عالم یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر یہ وعید کی ہے کہ کسی شخص نے پر اپنے بھائی پر کفر کا الزام لگایا تو یا وہ اپنی بات میں ٹھیک ہے ورنہ جھوٹا ہونے کی شکل میں اس کا اپنا ایمان سلب کر لیا جائے گا۔ ظاہر ہے کہ اس معاملے میں کسی کو الفاظ سے کافر کہنا ہی شامل نہیں کسی بھی ایسے کام کی نسبت کرنا جو کوئی کافر ہی کرسکتا ہے، کہنے والے کے لیے قیامت کے دن ایسے ہی سنگین نتائج پیدا کر دے گا۔

بدقسمتی سے یہ ہمارا عام رویہ ہے کہ فرقہ وارانہ اختلاف میں عام اطمینان سے لوگوں کو کافر کہتے ہیں۔ فکری و علمی اختلاف کی شکل میں کسی بھی شخص کو اطمینان کے ساتھ دشمنوں کا ایجنٹ قرار دیتے ہیں۔ یہ ظاہر ہے کہ کفر کے الزام کی دوسری شکل ہے۔ ہم کسی کو بدنام کرنے کے لیے اس کے اعمال کے محرکات، قلبی کیفیات اور نیت کو اس طرح زیر بحث لاتے ہیں کہ گویا ہم پیغمبر ہیں اور اللہ تعالیٰ ہمیں وحی کر کے بتا رہے ہیں کہ کسی نے کوئی کام کیوں کیا ہے۔ ان میں سے ہر رویہ روز قیامت ذلت و جہنم کی جس آگ میں ہمیں دھکیلے گا، اس کا ہلکا سا اندازہ بھی کسی کو ہو جائے تو ساری زندگی وہ لکھنا اور بولنا چھوڑ دے۔

اختلاف رائے میں ایک دوسری خرابی یہ ہے کہ ہم ہمیشہ اس مفروضے سے شروع بات شروع کرتے ہیں کہ ہم آخری درجے کے حق پر کھڑے ہیں اور سامنے والا باطل ہے۔ جس طرح کسی کے دل کا حال صرف اللہ جان سکتا ہے، اسی طرح حق پر صرف اللہ کے پیغمبر کھڑے ہوتے ہیں۔ باقی لوگ سب انسان ہیں اور ہمیشہ امکان ہوتا ہے کہ خود کو درست سمجھنے کے باوجود وہی غلطی پر ہوں۔ اس لیے اختلاف رائے کی شکل میں اپنی بات دلیل سے بیان کر دینا چاہیے۔ اس سے آگے بڑھ کر کسی سے اختلاف رائے کی شکل میں اس کے خلاف مہم چلانا یا اسے مجبور کرنا کہ ہماری بات صحیح مانو ورنہ اسے بدنام کرنا، اسے طعن و تشنیع اور نفرت کا موضوع بنانا وغیرہ غیر اخلاقی رویے ہیں جس کی جوابدہی اللہ تعالیٰ کے ہاں ہوگی۔

اختلاف رائے میں تیسری چیز یہ ہے کہ اکثر لوگ علم اور تربیت کے بغیر پورے اعتماد سے گفتگو کر رہے ہوتے ہیں۔ وہ ادب اور زبان کے اسالیب کو گہرائی میں نہیں سمجھتے اور پورے اعتماد سے کلام کے معنی پر گفتگو کر رہے ہوتے ہیں۔ وہ حذف، تخصیص، ایجاز جیسی باریک باتوں کو نہیں سمجھتے، مگر کسی دوسرے کے کلام پر ایسے فیصلہ دیتے ہیں جیسا کہ وہ اس موضوع پر اتھارٹی ہوں۔ بعض اوقات لوگ پوری علمی روایات کی طرف سے گفتگو کرتے ہیں، اسلاف کے موقف کی ترجمانی کرتے ہیں اور حال یہ ہوتا ہے کہ انھیں معلوم ہی نہیں ہوتا کہ علم کی روایت اور اسلاف کا نقطہ نظر ان کے خلاف ہے۔ یہ چیزیں جس شخص میں ہوں اسے نہ کوئی بات سمجھائی جا سکتی ہے نہ وہ کبھی اپنی غلطی مان سکتا ہے۔ البتہ دوسرے پر پورے اعتماد سے فیصلے ضرور دے سکتا ہے۔

اگلا مسئلہ یہ ہے کہ ہم کبھی دیانت داری سے دوسرے کا نقطہ نظر سمجھنا ہی نہیں چاہتے۔ ہمارا اصل مسئلہ اپنی انانیت کا جھنڈا گاڑنا ہوتا ہے۔ سامنے والا لاکھ کہے کہ میں یہ بات نہیں کہہ رہا جو آپ بیان کر رہے ہیں۔ مگر معاملہ بات سمجھنے سمجھانے کا نہیں بلکہ فتح و شکست کا ہوتا ہے یا کسی کو

بدنام کرنا مقصود ہوتا ہے۔ اس لیے بارہا ایک غلط بات کسی کی طرف ٹھونسی جاتی ہے اور پھر اس کی بنیاد پر کسی کے صحیح و غلط ہونے کا فیصلہ کیا جاتا ہے۔

یہ سب چیزیں جب جمع ہو جاتی ہیں تو بدتہذیبی، غیر شائستگی، الزام و بہتان جیسی چیزیں خود بخود کلام کا حصہ بن جاتی ہیں۔ یہ سب اپنی ذات میں خود ایک منفی عمل ہے جو دوسرے کو تو کم مگر ناقد کو زیادہ نقصان پہنچاتا ہے۔

اس لیے اختلاف اور تنقید کا درست طریقہ یہ ہے کہ دیانت داری سے کسی شخص کی پوری بات اور نقطہ نظر کو سمجھا جائے۔ اعتراض کرنے سے پہلے سوال کر کے بات کو سمجھنے کا عمل کیا جائے۔ معاملہ علمی ہے تو اعتراض اٹھانے سے پہلے اس موضوع پر نمایاں اہل علم کا نقطہ نظر سمجھا جائے تا کہ ہمارا اعتراض کہیں ہماری جہالت کا آئینہ دار نہ بن جائے۔ متعلقہ شخص موجود ہو تو اس سے اس کی بات کا مطلب سمجھ لیا جائے۔ اگر وہ کوئی وضاحت دے تو قبول کر لی جائے۔ اگر اس کی بات ہمارے نزدیک قابل قبول نہ ہو تب بھی اسے اپنی رائے رکھنے کا حق دیا جائے۔ تنقید کرنی ہو تو فرد یا گروہ کے بجائے نقطہ نظر پر کی جائے۔ اس میں بھی لب و لہجہ شائستہ رکھا جائے۔ کسی فرد یا گروہ کو بدنام کرنے کے بجائے اس کے حوالے سے وہی بات کہی جائے اور اسی طرح کہی جائے جس طرح وہ خود بیان کرتا ہو۔

جب اختلاف اس طرح کیا جائے گا تو کبھی فساد میں نہیں بدلے گا بلکہ علم کی روایت میں ترقی ہوگی۔ معاشرے میں نئے خیالات کو فروغ ہوگا۔ باہمی محبت اور رواداری معاشرے میں امن و خیر خواہی کا ماحول فروغ پائے گا۔ یہ نہیں ہوگا تو سماج میں نفرت اور بدامنی کا ماحول فروغ پاتا رہے گا۔ لوگ ایک دوسرے سے نفرت کرتے رہیں گے اور کافر قرار دیتے رہیں۔ اس سارے ماحول میں علم اور دعوت دین دونوں کی موت واقع ہو جائے گی۔

سلسلہ روز و شب

ابو یحییٰ

سر اور دھڑ

محترم قارئین! ایک طویل عرصے سے میں نے پاکستان کے سیاسی معاملات پر کچھ لکھنا چھوڑ رکھا ہے۔ تاہم پاکستان کے موجودہ حالات کے تناظر میں جب کہ تبدیلی حکومت بذریعہ دھرنا کی سوچ عام ہے، بعض احباب کا یہ تقاضہ شدت سے سامنے آیا کہ مجھے کچھ نہ کچھ اس حوالے سے لوگوں کی رہنمائی کے لیے لکھنا چاہیے۔

میرا معاملہ یہ ہے کہ میرا نشانہ فرد کی اصلاح ہے۔ اس کے آگے بڑھ کر بس سماج میرا موضوع رہتا ہے۔ سیاسی امور پر لکھنے کے لیے ویسے بھی بہت اچھے لوگ موجود ہیں۔ تاہم احباب کے اصرار پر میں آج ایک اصولی بات کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں۔ اس کے ذیل میں موجودہ سیاسی حالات کی کچھ جھلک بھی آپ دیکھ سکیں گے۔ حالات تو بدلتے رہتے ہیں، لیکن اصول نہیں بدلنے چاہییں اور اسی بات پر توجہ دلانا مقصود ہے۔

سماج اور اقتدار

انسان ایک سماجی وجود ہے۔ وہ تنہا نہیں رہتا بلکہ لوگوں کے ساتھ مل کر رہتا ہے۔ انسانوں نے جب افراد سے آگے بڑھ کر گروہوں کی شکل میں مل جل کر ساتھ رہنے کا چلن اختیار کیا تو اپنے باہمی تنازعات کو سلجھانے اور بیرونی خطرات سے نمٹنے کے لیے ایک ریاست کی شکل اختیار کر لی۔ اس ریاست کی سربراہی کے لیے انسانیت نے اپنی تاریخ میں دو ہی طریقے اختیار کیے ہیں۔ ایک یہ کہ جس کے پاس طاقت ہو وہ اقتدار پر قبضہ کر لے۔ دوسرا یہ کہ جس شخص کو لوگوں کا اعتماد اور عصبیت حاصل ہو اسے اقتدار دے دیا جائے۔

اقتدار ملنے کا ایک تیسرا طریقہ بھی رہا ہے۔ اس طریقے میں اللہ تعالیٰ خود ہی حکمران کا فیصلہ کر دیا کرتے تھے۔ وہ طالوت کی طرح کوئی عام انسان بھی ہوسکتا تھا اور حضرت موسیٰ، حضرت داؤدؑ اور سرکار دو عالم علیھم السلام اجمعین کی طرح نبی بھی ہوسکتا تھا۔ لیکن ختم نبوت کے بعد اب چونکہ اس کے ظہور میں آنے کا کوئی امکان نہیں اس لیے اس کا ذکر ہم جانے دیتے ہیں۔

پرامن انتقال اقتدار

پاکستان کے عوام نے اپنے لیے انسانی تاریخ کے ان دو طریقوں یعنی بالجبر اقتدار پر قبضہ اور اور عوام کی مرضی سے حکمران کے انتخاب میں سے دوسرے طریقے کا انتخاب کیا ہے۔ اس ملک کے بانیان، سیاستدانوں، دانشوروں اور ممتاز ترین علمائے کرام اور معاشرے کے تمام نمائندہ طبقات نے متفقہ طور پر اسی طریقے کو ریاست کا دستور بنایا ہے۔

اس طریقے کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں کسی کو حکمران بنانے سے بڑھ کر اسے اقتدار سے پرامن طور پر ہٹانے کا طریقہ ہمیشہ کے لیے طے کر دیا جاتا ہے۔ جو لوگ تاریخ کے علم سے ادنیٰ سی واقفیت بھی رکھتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ زبردستی اقتدار پر قبضہ کرنے والے فرد، گروپ یا خاندان کو اقتدار سے ہٹانے کی ہر کوشش میں خواہ وہ کوشش کامیاب ہو یا ناکام، ہمیشہ بہت بڑے پیمانے پر خونریزی، بدامنی اور فساد برپا ہوتا ہے۔ اس کی قیمت عام لوگ ادا کرتے ہیں جن کی پرسکون زندگی کو سیاست کا یہ ہنگامہ برباد کر کے رکھ دیتا ہے۔ یہ کبھی نہ بھی ہو تب بھی زبردستی اقتدار پر قبضہ کرنے والے لوگ ہر قیمت پر اپنا اقتدار برقرار رکھنے کی کوشش میں معاشرے کو تباہ کر کے رکھ دیتے ہیں۔

بدقسمتی سے پاکستان میں بار بار طاقت کے زور پر اقتدار کو تبدیل کیا جاتا رہا اور اس کی قیمت معاشرہ ادا کرتا رہا ہے۔ پچھلے کچھ عرصے سے یہ امید ہو چلی تھی کہ شاید یہ صورتحال تبدیل

ہو جائے، مگر ایک دفعہ پھر ملک میں دھرنوں اور احتجاج کے ذریعے سے اقتدار پر قبضے اور حکمرانوں کی تبدیلی کی بات ہورہی ہے۔ یہ کام کرنے والے خواہ اپنے موقف کے حق میں کتنے ہی دلائل دے دیں، اگران کا طریقہ کارہی غلط ہے تو پھر کسی صورت اس کی تائید نہیں کی جاسکتی۔

ہمارے نظام کی خرابیاں

اس میں کوئی شک نہیں کہ موجودہ نظام میں عدل و انصاف کے تقاضے پورے نہیں کیے جاتے۔ عوامی شکایات کے ازالے اور ضروریات کو پورا کرنے کا نظام بہت کمزور ہے۔ حکمرانوں کے حوالے سے کی جانے والی بہت سی شکایات درست ہیں۔ پچھلے انتخابات میں کچھ نہ کچھ دھاندلی بھی ہوئی ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ اگر کسی غیر اخلاقی، غیر دینی اور غیر قانونی طریقے سے موجودہ حکومت کو ختم کرنا جائز ہے تو پھر فرض کر لیجیے کہ عمران خان صاحب یا طاہر القادری صاحب اقتدار میں آجائیں تو ان کی حکومت کو ایسی ہی شکایات کر کے اور ایسے احتجاج اور دھرنوں سے ختم کرنا کیوں جائز نہ ہوگا؟ یہ راستہ اگر کھل گیا تو پھر کسی کے لیے حکومت کرنا ممکن نہیں رہے گا۔ جو شخص دو پانچ لاکھ لوگ جمع کرسکتا ہے وہ ملک کا نظم ونسق برباد کر کے رکھ دے گا۔ اس لیے کوئی باشعور شخص اس طریقے کی تائید نہیں کرسکتا۔

مستقبل کو چھوڑیے اگر پختون خواہ کی موجودہ حکومت کو وہاں کی سابقہ حکمران پارٹی یعنی اے این پی اپنی شکست کے بعد ٹھیک ایسی ہی شکایات کر کے اور ایسے ہی دھرنوں سے ختم کرنے کے لیے اٹھ کھڑی ہو تو وہ کیسے غلط ہوں گے؟

اس طرح کی بے اصولی کا جو لوگ مظاہرہ کر رہے ہیں، ان سے اس کی توقع کرنا بہت مشکل ہے کہ وہ اقتدار میں آکر کسی اصول وضابطے کی کوئی پروا کریں گے۔ ہاں اگر کسی پرامن طریقے پر احتجاج کا مقصد سسٹم کو بہتر بنانا ہے، اس بات کو یقینی بنانا ہے کہ اس ملک کے کسی انتخاب میں کوئی

دھاندلی نہ ہو، حکمرانوں پر دباؤ بڑھانا ہے کہ وہ اپنی کارکردگی بہتر کریں تو یقیناً اس کا خیر مقدم ہونا چاہیے۔ بلکہ سب لوگوں کو اس کا ساتھ دینا چاہیے۔ لیکن احتجاج اگر سسٹم ہی کو ختم کر دے، معاشرے کو مفلوج کر دے، اصل مسائل سے توجہ ہٹا دے، عام لوگوں کے لیے مزید مشکلات پیدا کر دے تو اس کی تائید کیسے کی جاسکتی ہے۔

ہمارے نزدیک موجودہ سیاسی کشمکش میں ایک بڑا اثبت امکان یہ چھپا ہوا ہے کہ بجائے اس کے کہ یہ کشمکش نظام کو مفلوج یا معطل کر دے، یہ نظام میں بہتری لانے کا ایک ذریعہ بن سکتی ہے۔ اس میں سب سے اہم چیز یہ ہے کہ ہر طرح کی دھاندلی سے محفوظ بائیومیٹرک سسٹم کا نظام رائج کیا جائے۔ انڈیا میں یہ ہو چکا ہے اور ہمارے ہاں نادرا جیسے ادارے کی موجودگی میں جس کے پاس ملک کے تمام لوگوں کو ڈیٹا اور فنگر پرنٹ موجود ہے، اس کا نفاذ کوئی مشکل نہیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ ہماری اسمبلیاں عام طور پر پانچ برسوں کے لیے منتخب ہوتی ہیں۔ اس کے بعد منتخب لوگ بھول جاتے ہیں کہ وہ عوام سے کیا وعدے کر کے آئے ہیں۔ چنانچہ ضروری ہے کہ اسمبلیوں سے منتخب ہونے والوں کو پانچ کے بجائے چار سال بعد دوبارہ عوام کے پاس جانا چاہیے۔ فوری طور اگر یہ دو تبدیلیاں ہی کر دی جائیں تو عوامی احتساب بتدریج صورتحال کو بہتر کرتا چلا جائے گا۔

سماج کی مچھلی کا دھڑ اہم ہے

آخر میں ہم اس حقیقت پر بھی توجہ دلانا چاہتے ہیں کہ پاکستانی معاشرے میں خرابی کی بڑی وجہ اشرافیہ اور سیاستدانوں کا رویہ ہے، مگر معاشرے کے دیگر طبقات بھی اپنے اپنے دائرے میں اسی نوعیت کی خرابیاں پیدا کر رہے ہیں۔ یہ سوچنا محض ایک نادانی ہے کہ اوپر کا سسٹم بدل دیا جائے تو سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ چینی کہاوت ہے کہ مچھلی سر سے گلتی ہے یعنی معاشرہ اشرافیہ کی

خرابی سے خراب ہوتا ہے۔مگر ہمارے آقا نبی کریم علیہ السلام نے ہمیں یہ سکھایا ہے کہ مچھلی اگر سر سے گل جائے تو گلے ہوئے سر کو زبردستی ٹھیک کرنے کے بجائے باقی جسم کو سڑنے سے بچانے میں لگ جانا چاہیے۔ کیونکہ معاشرہ وہ مچھلی ہے جس کا دھڑ ٹھیک رہے تو گلے ہوئے سر کی جگہ نیا سر پیدا ہو جاتا ہے، مگر دھڑ ہی سڑ جائے تو پھر مکمل تباہی کے علاوہ کوئی امکان نہیں بچتا۔

پاکستان کی بدقسمتی ہے کہ یہاں کہ اہل دانش اپنے آقا کا یہ فرمان بھول کر گلے ہوئے سر کو ٹھیک کرنے کی کوشش میں لگ گئے۔ یہاں تک کہ اب دھڑ ہی سڑنے لگا ہے۔مگر اب بھی وقت ہے۔ کچھ لوگ سر کے بجائے دھڑ کو نشانہ بنالیں تو ایک نسل میں صورتحال بدل جائے گی۔ ورنہ ایسے انقلابی دھرنے، تحریکیں اور انقلاب ہم نے بہت دیکھے ہیں۔ان سے تباہی زیادہ ہوتی ہے اور خیر کم نکلتا ہے۔

ابو یحییٰ

بائبل میں قیامت کا تصور

[یہ خط ایک مسیحی کے اس اعتراض کے جواب میں لکھا گیا ہے جس میں انھوں نے ''جب زندگی شروع ہوگی'' کے مصنف ابو یحییٰ پر یہ اعتراض کیا تھا کہ انھوں نے اپنی کتاب میں مسیحیت کے بارے میں درست حقائق نہیں بیان کیے اصل خط انگریزی میں تھا جس کا ترجمہ رسالے کے لیے عبداللہ صاحب نے کیا ہے۔]

محترم بھائی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کی ای میل کا شکریہ۔ میں آپ کے احساسات کی قدر کرتا ہوں۔ لیکن درحقیقت بائبل کی جو آیات آپ نے مجھے بھیجی ہیں وہ میری بات کی تصدیق کرتی ہیں۔ میں نے یہ نہیں کہا کہ قدیم صحیفوں میں میں روز قیامت کا تذکرہ نہیں ہے۔ بلکہ میں نے یہ کہا ہے کہ ان میں آخرت کے تصورات مبہم ہیں۔ اور جو آیات آپ نے مجھے بھیجی ہیں ان سے یہ بات بالکل واضح ہورہی ہے۔ میری اس بات کی تصدیق کے لیے آپ یہ آیات کسی بدھ ازم کے پیروکار کو بتایئے۔ وہ سوائے ''قیامت کے دن'' کے اور کسی بات کو بھی سمجھ نہیں سکے گا۔ جبکہ دوسری طرف اگر میں اس کو روز قیامت کی تفصیلات قرآن و حدیث سے پیش کروں تو قطع نظر اس بات کے کہ وہ اس کو مانے یا نہ مانے کم از کم وہ واضح طور پر روز قیامت کی تمام تر تفصیلات جان لے گا۔

دوسری اہم بات یہ ہے کہ بائبل کی کئی آیات میں بیان ہونے والی سزا دوبارہ جی اٹھنے کے دن یعنی روز قیامت کے حوالے سے نہیں ہے بلکہ درحقیقت یہ وہ واقعہ ہے جو اس دنیا میں ظہور

پذیر ہوا۔مثال کے طور پر آپ نے جو پہلی آیت کا حوالہ دیا وہ کچھ یوں ہے۔
خدا فرماتا ہے،" میں دنیا کو اس کی برائی کے سبب سے اور شریروں کو ان کی بدکرداری کی وجہ سے سزا دوں گا۔اور میں مغروروں کا غرور اور ظالم لوگوں کا گھمنڈ پست کروں گا۔(یسعیاہ 13:11)
اس آیت کے عمومی اسلوب سے آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے لیکن اس باب کا سرعنوان واضح طور پر یہ بتا رہا ہے کہ یہ دراصل بابل کی تباہی سے متعلق ہے۔ اس کی پہلی آیت ہی یہ ہے:
یہ بابل کے بارے میں خداوند کا پیغام ہے جو یسعیاہ بن آموص نے رویا میں حاصل کیا۔
اب اگر آپ آگے پڑھیں تو جب آپ آیت 15 پر پہنچیں گے تو آپ کو اس حقیقت کا ادراک ہو گا کہ یہ سزا انسانوں کے ذریعہ سے تھی۔آیت 17 میں ان لوگوں کا نام بتایا جا رہا ہے کہ وہ medes یعنی میڈیا یعنی قدیم ایران کے باسی (مادی) تھے جنہوں نے بابل (Babylon) پر حملہ کیا۔اس کے بعد اگلی آیات میں یہ حقیقت نام لے کر کھول دی گئی ہے کہ زیر بحث بابل کی تباہی نہ کہ دنیا کی تباہی۔آیات درج ذیل ہیں۔
” 15 ہر ایک شخص جسے پایا جائے گا اسے موت کے گھاٹ اتار دیا جائے گا۔ ہر ایک شخص کو جسے پکڑا جائے گا اسے تلوار سے مار دیا جائے گا۔ 16 ان کے گھروں کی ہر شے لوٹ لی جائے گی ان کی بیویوں کی بے حرمتی کی جائے گی اور ان کے بال بچوں کو ان کی آنکھوں کے سامنے مار ڈالا جائے گا۔ 17 خدا فرماتا ہے،" میں مادی (یعنی قدیم ایران) کی فوجوں میں بابل پر حملہ کرواؤں گا۔ مادی چاندی کی پرواہ نہیں کرتے ہیں۔اور نہ ہی وہ سونے سے خوش ہوتے ہیں۔ 18ان کی کمان اور تیر جوان آدمیوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے گی۔لیکن وہ شیر خواروں پر رحم نہیں کرے گا۔وہ بچوں کے لئے بھی افسوس نہیں کرے گا۔ 19 بابل کا سب کچھ سدوم اور عمورہ کی طرح تباہ ہو جائے گا۔خدا اس تباہ کاری کو ابھارے گا اور کچھ بھی باقی بچا نہ رہے گا۔ بابل سب

سے خوبصورت سلطنت ہے کسدیوں کو بابل پر فخر ہے۔ لیکن بابل سدوم اور عمورہ کی طرح تباہ ہو جائے گا، جب خدا انہیں پوری طرح سے تباہ کر دے گا۔ 20 لوگ بابل میں پھر سے کبھی نہیں رہیں گے۔ بابل کا حسن قائم نہیں رہے گا۔ لوگ وہاں چھاؤنی نہیں لگائیں گے۔ عرب کبھی بھی اپنا خیمہ وہاں قائم نہیں کریں گے۔ چرواہا اپنی بھیڑوں کو وہاں سونے نہیں دے گا۔‘‘

لہٰذا میں معذرت کے ساتھ یہ عرض کروں گا کہ بائبل کو آپ نے غلط سمجھا۔ میں مسلمان ہوں اور اللہ پاک کے فضل سے بائبل کو آپ سے زیادہ بہتر جانتا ہوں۔

والسلام

ابو یحییٰ

جن معاملات میں آپ کچھ نہیں کرسکتے
ان کے لیے پریشان ہونا نادانی ہے
اور جن معاملات میں آپ کچھ کر سکتے ہیں
ان کے لیے پریشان ہوتے رہنا
زیادہ بڑی نادانی ہے (ابو یحییٰ)

جو وقت کو برباد کرتا ہے
وقت اسے برباد کردیتا ہے (ابو یحییٰ)

سوال وجواب

ابویحییٰ

کتاب متروک

سوال: السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

سورہ الفرقان کی آیت30 (وَقَالَ الرَّسُولُ يَا رَبِّ إِنَّ قَوْمِي اتَّخَذُوا هَذَا الْقُرْآنَ مَهْجُورًا یعنی''اوررسول کہیں گے کہ اے رب میری قوم نے اس قرآن کو'مہجور' بنالیا تھا۔'') سے متعلق درج ذیل سوالات ہیں:

اِس قولِ رسول کا موقع دنیا ہے، یا آخرت؟

"قَوْمِي " سے مراد مسلم ہیں، یا غیر مسلم؟

"مَهْجُورًا " کا مطلب کیا ہے؟

کیا اِس آیت کا انطباق مسلمانوں پر ہوسکتا ہے، جن کے درمیان عملاً قرآن ''کتاب مھجور'' بن چکا ہے؟

محمد ذکوان ندوی

جواب:

یہ آیت جس سیاق میں آئی ہے وہ مشرکین مکہ کا یہ اعتراض ہے کہ ہم اس رسول اور اس کلام کو نہیں مانیں گے جب تک ہم فرشتوں اور خود اللہ تعالیٰ کو نہ دیکھ لیں یا وہ ہم تک خود اپنا پیغام نہ پہنچائیں۔ جواب میں یہ کہا جارہا ہے کہ جس روز یہ فرشتوں کو دیکھ لیں گے اس روز ان کے لیے کوئی خوشخبری نہیں ہوگی۔ اس کے بعد کی آیات قیامت کے دن کے ہی حوالے سے ہیں۔ اور آخر میں آیت 30 میں اس گواہی کا ذکر ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دیں گے۔ اس روشنی

میں آپ کے سوالات کے جواب درج ذیل ہیں۔

۱) قول رسول کا موقع روز قیامت ہے۔

۲) قومی سے مراد مشرکین مکہ ہیں یعنی غیر مسلم۔

۳) مہجورا کے مادے کے لحاظ متعدد ترجمے کیے گئے ہیں۔ ایک ترجمہ ترک کرنے یا چھوڑنے کا کیا جاتا ہے۔تاہم میرے نزدیک قرآن مجید کی اسی سورت کے آغاز میں آیت 4 اور 5 میں بیان کیا گیا ہے کہ کفار مکہ قران کو افک یعنی جھوٹ اور اساطیر الاولین یعنی پچھلوں کی داستانیں قرار دیتے تھے۔لہٰذا 'مہجور' کے الفاظ سے غالبا اسی طرف اشارہ ہے کہ انہوں اس عظیم کتاب کو ماننے کے بجائے اسے اپنی فضول بکواس کا موضوع بنائے رکھا تھا۔

۴) چوتھے سوال میں آپ غالبا کتاب مہجور سے مراد کتاب متروک لے رہے ہیں۔عملاً تو یہ بات بالکل ٹھیک ہے۔ ماننے والے جب ماننے کے باوجود کتاب کو چھوڑ دیں تو اس پر سب سے اچھا تبصرہ خود اللہ تعالیٰ نے سورہ بقرہ (101) میں یوں کیا ہے کہ ان اہل کتاب میں سے ایک گروہ نے کتاب الہی کو اپنی پیٹھ کے پیچھے اس طرح پھینک دیا کہ گویا وہ اسے جانتے ہی نہیں۔یا جس طرح سورہ جمعہ (5) میں کتابوں کا بوجھ اٹھائے ہوئے گدھے سے تعبیر کیا ہے۔

ظاہر ہے کہ ہم مسلمانوں نے جس طرح قرآن مجید کو نظر انداز کیا ہے اور اسے بالکل پیچھے کر دیا ہے اس پر یہی تبصرہ کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ ہمارا اصل مسئلہ اور جرم یہی ہے کہ ہم نے قرآن مجید کو چھوڑ دیا ہے۔ہمیں اپنے لوگوں کو قران مجید کی طرف لانا چاہیے۔یہی کرنے کا کام ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ ہم نے قران مجید کو پیٹھ پیچھے بھی پھینک رکھا ہے اور کتاب متروک بھی بنا رکھا ہے۔اس پہلو سے ہم بھی سورہ جمعہ والے گدھے ہیں۔

تلاوت قرآن سے متعلق ایک حدیث

سوال: السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

اللہ پاک سے دعا ہے کہ اللہ پاک مجھے سیدھے راستے کی رہنمائی فرمائے۔ جب سے میں نے قرآن پاک کا مطالعہ شروع کیا اور خالق کائنات کی نازل کردہ کتاب پر توجہ دینی شروع کی تو مجھے پتہ چلا کہ جیسا کہ قرآن میں بیان ہوا ہے، یہ واقعی انسانیت کے لیے ہدایت ہے۔ اور میرا یہ ماننا ہے کہ یہ کتاب اللہ ہے تو اسے صرف نیکیوں کے حصول کے لیے ہی نہیں پڑھنا چاہیے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ ہم ہر کتاب، میگزین اور اخبار پڑھتے وقت اس کا سمجھنا یقینی بنائیں لیکن قرآن پاک کو بلا سمجھے پڑھتے جائیں؟ اور جب میں نے یہ حدیث سنی کہ الف لام میم پڑھنے سے تیس نیکیاں ملتی ہیں تو میں اور زیادہ کنفیوز ہو گیا کیوں کہ اس کے ظاہری مطلب سے تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ ہمیں قرآن پاک سمجھ کر پڑھنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اور جب میں نے سورۃ فرقان میں یہ پڑھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خود امت کے خلاف کیس دائر کریں گے اور قرآن پاک کو اس پر گواہ بنائیں گے تو مجھے ذاتی طور پر یہ محسوس ہوا کہ اللہ پاک کے احکامات کی پیروی کے بغیر اور سمجھے بغیر قرآن پاک پڑھنا غلط ہے۔ برائے کرم آپ اس حدیث کی سند کے بارے میں بتا دیجیے۔ جزاک اللہ خیر

نجم، کینیڈا

جواب: وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ نے بالکل درست فرمایا۔ قرآن مجید کو سمجھ ہی کر پڑھنا چاہیے۔ باقی جس روایت کی طرف آپ نے اشارہ فرمایا ہے وہ درج ذیل ہے۔

من قرأ حرفاً من كتاب الله فله به حسنة ، والحسنة بعشر أمثالها لا أقول (الم)

حرف ولكن :ألف حرف ولام حرف ، وميم حرف .((صحیح الجامع6469)

امام البانی نے اس کو درست قرار دیا ہے۔تاہم میرے نزدیک حدیث کا موقع محل سمجھ لیا جائے تو کوئی اشکال نہیں رہتا۔ یہ ظاہر ہے کہ اگر یہ بات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی ہےتو اس کے مخاطب صحابہ کرام ہی ہیں۔عربی ان کی اپنی زبان ہے جس میں قرآن مجید نازل ہوا ہے۔اب ایسے میں اگر ان سے یہ بات کہی جائے تو اس میں یہ بات خود بخود شامل ہے کہ یہ لوگ جب بھی قرآن پڑھیں گے تو لازماً سمجھ رہے ہوں گے۔ کیونکہ ان کے لیے پڑھنا اور سمجھنا بالکل ایک ہی ہے۔مگر ہمارے لیے یہ دو الگ الگ کام ہیں۔اس لیے ہمیں اس روایت پر اشکال محسوس ہوتا ہے ورنہ اپنے موقع محل میں یہ روایت ایک بالکل سیدھی سی بات بتا رہی ہے کہ یہاں پڑھنے میں سمجھنا ہر حال میں شامل ہے۔امید ہے بات واضح ہوگئی ہوگی۔

والسلام

ابو یحییٰ

اہل عرب میں نبوت کیوں؟

<u>سوال:</u> السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

ماشاءاللہ سر، آپ نے بہت مشکل ٹاپک کی بہت آسانی سے وضاحت کی۔میرا ایک سوال ہے برائے کرم جواب عنایت فرمائیں۔

اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے عرب معاشرے کو ہی کیوں منتخب کیا؟ ہم سنتے آئے ہیں کہ حضرت آدم کو سری لنکا کے علاقے میں اتارا گیا۔ اور یہ سارا سلسلہ عرب کیسے پہنچا۔ دنیا میں اور بھی سولائزیشنز تھیں؟ نجم،کینیڈا

جواب: وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

حضرت آدم علیہ السلام کے سری لنکا میں اترنے والی بات کسی مستند ماخذ میں موجود نہیں صرف ایک مشہور بات ہے۔

جہاں تک عرب کے انتخاب کا تعلق ہے تو اصل انتخاب حضرت ابراہیم اوران کی اولاد کا کیا گیا تھا۔ چنانچہ پہلے ان کی اولاد کے ایک حصے یعنی بنی اسرائیل کو نبوت وامامت عالم سے سرفراز کیا گیا اور تقریباً ڈیڑھ ہزار برس تک دنیا کی ہدایت و رہنمائی ان کے ذریعے سے کی جاتی رہی۔ تاہم جب ان کا بگاڑ حد سے زیادہ بڑھا اورانھوں نے حضرت عیسیٰ کا بھی انکار کر دیا تو انھیں اس منصب سے معزول کر دیا گیا۔

اس دوران میں حضرت ابراہیم کے بڑے صاحبزادے حضرت اسماعیل کی اولاد عرب میں ایک قوم بن چکی تھی۔ چنانچہ ان کے درمیان میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث کیا گیا۔ 23 برس کی جدوجہد کے بعد عرب معاشرے نے اسلام کو مکمل طور پر قبول کیا اور پوری دنیا پر شہادت حق کی وہی ذمہ داری ادا کی جو اس سے قبل بنی اسرائیل ادا کرتے رہے تھے۔

چنانچہ پچھلے چار ہزار برس سے دنیا میں وہی لوگ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہدایت کے منصب پر فائز ہیں جن کا تعلق آل ابراہیم سے ہے۔

زندگی میں پیش آنے والے ناگوار حالات
روزے دار کے ایک سخت دن کی طرح
آخر کار گزر جاتے ہیں
یہی رمضان کا اصل سبق ہے (ابویحییٰ)

ابویحییٰ

مضامین قرآن (11)

دلائل آخرت: قدرت کی دلیل

قرآن کی دعوت، اعتراض اور دلیل قدرت

حیات بعد از ممات قرآن مجید کا بنیادی مقدمہ ہے۔ اس کا دعویٰ یہی ہے کہ یہ دنیا عارضی ہے اور ایک روز آئے گا جب تمام انسانوں کو زندہ کیا جائے گا اور پھر ان کے عمال کی بنیاد پر ان کے ابدی انجام کا فیصلہ ہوگا۔ صالحین جنت کی بادشاہی میں اور بدکار جہنم کے قید خانے میں جائیں گے۔ اس دعویٰ کی بنیاد پر قرآن مجید انسانوں سے پوری زندگی بدلنے کا مطالبہ کرتا ہے۔ اعتقاد، اعمال، اخلاق، مراسم عبودیت، طرز زندگی، معیشت، معاشرت غرض اس دعوت کو مان لینے کے بعد ہر شعبہ زندگی میں زبردست انقلاب آجانا چاہیے۔

جو لوگ اپنی زندگی کو بدلنا نہیں چاہتے اور اخلاق کے بجائے خواہش اور مفاد کے اصول پر زندگی گزارنا چاہتے ہیں وہ چھوٹتے ہی یہ اعتراض کرتے ہیں کہ زندگی کے بعد موت ممکن نہیں۔ انسان زندگی کو جانتے ہیں۔ موت سے بھی واقف ہیں۔ لیکن مرنے کے بعد کسی کو زندہ ہوتے آج تک کسی نے نہیں دیکھا۔ لوگ دیکھتے ہیں کہ وہ مرتے ہیں اور خاک میں رل مل جاتے ہیں۔ جو بچتا ہے وہ بوسیدہ ہڈیاں ہوتی ہیں۔ قدیم زمانے کے لوگ صدیوں تک ایک ہی جگہ رہتے تھے۔ قرنوں سے موجود ان کے آباد واجداد کی قبریں ان کے سامنے ہوتی تھیں۔ کبھی کوئی زندہ ہوا نہ کسی ہڈی نے گوشت کا لبادہ اوڑھ کر انسانی قالب کو اختیار کیا۔ ایسے میں یہ دعویٰ کس طرح عقلی بنیادوں پر مان لیا جائے اور اس کی بنیاد پر پوری زندگی کا نقشہ ہی بدل دیا جائے کہ

ایک روز اگلے پچھلے سارے انسانوں کو زندہ کیا جائے گا اور پھر ایک نئی زندگی شروع ہوگی۔

یہی وہ مقام ہے جہاں سے آخرت کی یہ دلیل قرآن مجید میں بیان ہوتی ہے اور اتنے گونا گوں پہلوؤں سے بیان ہوتی ہے کہ اس اعتراض کی کمزوری نہ صرف پوری طرح کھل کر سامنے آجاتی ہے بلکہ معلوم ہوجاتا ہے کہ موت کے بعد زندگی ہر ہر پہلو سے انسانوں کے شب و روز کا مشاہدہ ہے اور اس کا انکار کوئی شخص کبھی نہیں کرسکتا۔

یوں تو قرآن مجید نے متعدد پہلوؤں سے اس دلیل کو پیش کیا ہے، مگر جب تدبر کی نگاہ سے قرآن مجید کا مطالعہ کیا جاتا ہے تو اندازہ ہوتا کہ قدرت کے استدلال کو تین پہلوؤں سے نمایاں کیا گا ہے جو کہ درج ذیل ہیں۔

۱) ان انسانی مشاہدات کو سامنے رکھ کر جن میں انسان ہر روز مردہ چیزوں کو زندہ ہوتے دیکھتے ہیں۔

۲) انفس و آفاق میں جو کچھ موجود ہے اس صناعی و کاریگری کی عظمت کو سامنے رکھ کر یہ بتایا گیا ہے کہ تخلیق کا اتنا مشکل اور اتنا نازک معاملہ پہلی دفعہ کیا جاسکتا ہے تو دوبارہ بھی کیا جاسکتا ہے۔

۳) اللہ کے علم وقدرت کے ان پہلوؤں کو سامنے رکھنا جو یہ بتاتے ہیں کہ مرنے والے انسانوں کے لیے فنا ہوتے ہیں، اللہ تعالیٰ کے علم وقدرت سے وہ کسی طور باہر نہیں نکلتے، اس لیے وہ جب چاہے گا انھیں دوبارہ اٹھا کھڑا کرے گا۔

ذیل میں ہم قرآنی بیانات کی روشنی میں ان تینوں پہلوؤں کی تفصیل کریں گے۔

مردہ مخلوقات کا زندہ ہونا

قرآن مجید کئی پہلوؤں سے اس حقیقت کو لوگوں کے سامنے بالکل نمایاں کرکے رکھ دیتا ہے کہ موت کے بعد جس زندگی کے وہ منکر ہیں، وہ اس دنیا کا ایک روزمرہ کا مشاہدہ ہے۔ اس سلسلے

کی سب سے نمایاں نشانی وہ مردہ زمین کی پیش کرتا ہے۔ انسانوں کا عام مشاہدہ ہے کہ زمین خشک اور بنجر پڑی ہوتی ہے۔ ہر طرف خاک اور دھول اڑتی ہے۔ سبزے کا ایک نشان تک نہیں ہوتا۔ صبح و شام گزرتے ہیں۔ شب و روز بیت جاتے ہیں۔ موسم اور مہینے بدل جاتے ہیں۔ مگر مردہ زمین کی قسمت نہیں بدلتی۔ یہاں تک کہ ایک روز یک بیک ٹھنڈی ہوا چلتی ہے۔ کچھ ہی دیر میں ہوا کے لطیف شانوں پر براجمان جھومتے اور ڈولتے بادل نمودار ہوتے ہیں۔ تپتا آسمان رنگ بدلتا ہے۔ ابر کرم کی برسات شروع ہوتی ہے۔ ہر چیز جل تھل ہو جاتی ہے۔ برسات کا یہ سلسلہ جاری رہتا ہے۔ ایک روز کوئی مسافر اس سرزمین سے گزرتا ہے۔ وہ حیران رہ جاتا ہے کہ جاتے وقت وہ جس زمین کو سنگلاخ چھوڑ گیا تھا وہ سرسبز و شاداب ہو گئی ہے۔ ہر طرف نباتات کی بہار ہے۔ درخت شاداب ہو چکے ہیں۔ پھول و پودوں کی بہار آئی ہوئی ہے۔ مردہ زمین زندہ ہو چکی ہے۔ قرآن مجید یہ مشاہدہ سامنے رکھ کر کہتا ہے کہ ایسے ہی ایک روز مردہ انسان زندہ کر دیے جائیں گے۔

دوسری نشانی خود انسان کا اپنا وجود ہے۔ اللہ نے رات کو دھرتی کا لباس اور نیند کو دافع کلفت بنایا ہے۔ دن بھر کی معاش کی جدوجہد کے بعد انسان کی یہ ضرورت بن جاتی ہے کہ وہ رات کے وقت نیند کے دامن میں پناہ ڈھونڈے۔ رات بھر وہ سوتا رہتا ہے اور صبح دم تازہ ہو کر نئے دن کا آغاز کرتا ہے۔ قرآن مجید اس نیند کو موت اور اس بیداری کو روز حشر کی بیداری کی تمثیل کی شکل میں پیش کر کے کہتا ہے کہ اس عارضی موت اور پھر اس کے بعد بیداری کا تجربہ تم ہر روز کرتے ہو۔ اس کے بعد تم موت کی نیند کے بعد صبح ازل بیداری کے منکر کیسے ہو سکتے ہو۔

تیسری نشانی اجرام فلکی ہیں۔ سورج دن میں طلوع ہوتا اور رات میں غروب ہو جاتا ہے۔ جبکہ چاند اور تارے رات میں نکلتے اور دن میں ڈوب جاتے ہیں۔ مگر ہم جانتے ہیں کہ سورج کا

ہر غروب ایک نئی طلوع کی نوید ہے اور ہمیں اس پر کوئی شک نہیں ہوتا۔ سوال یہ ہے کہ جو خدا ڈوبے سورج کو دوبارہ نکال سکتا ہے وہ موت کی غروب کو زندگی کا طلوع دینے سے کیسے عاجز رہ سکتا ہے۔

پھر قرآن مجید انفس و آفاق کی انھی نشانیوں تک محدود نہیں رہتا بلکہ انسانی تاریخ کے بعض ایسے واقعات سامنے رکھتا ہے جن کی شہادت ایک زمانے نے دی ہے۔ مثال کے طور پر اصحاب کہف کے واقعے کو وہ تفصیل سے بیان کر کے یہ بتاتا ہے کہ انسانوں نے اپنی آنکھوں سے بھی مردوں کو زندہ ہوتے دیکھا ہے کہ کس طرح صدیوں تک سوئے ہوئے لوگ معجزانہ طریقے پر نہ صرف زندہ ہو گئے بلکہ حیات بعد از ممات پر جب لوگوں کو شک ہونے لگا تو اس کی ایک جیتی جاگتی مثال بن کر لوگوں کے سامنے آ گئے۔ یہی معاملہ سیدنا مسیح کا تھا جو اللہ کے اذن سے مردوں کو زندہ کر کے دکھاتے تھے، (آل عمران 110:3)۔ اسی طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کو تو ان کی فرمائش پر مردہ پرندوں کو زندہ کر کے دکھایا تھا، (البقرہ 260:2)۔

یوں انسانی مشاہدات ہی یہ ثابت کرنے کے لیے کافی ہیں کہ جو اللہ ان مخلوقات کو تمھاری آنکھوں کے سامنے مردہ کر رہا ہے، اس کے لیے کیا مشکل ہے کہ وہ انسان کے مردہ ہو جانے کے بعد انھیں زندہ نہ کر سکے۔

قرآنی بیانات

قرآن مجید میں حیات بعد از ممات کے تصور پر کفار کے رویے کو اس طرح بیان کیا گیا ہے۔

بلکہ ان لوگوں کو تعجب ہوا کہ ان کے پاس انھی کے اندر سے ایک آگاہ کرنے والا آیا تو کافروں نے کہا کہ یہ تو ایک نہایت عجیب بات ہے۔ کیا جب ہم مر جائیں گے اور مٹی ہو جائیں گے (تو دوبارہ لوٹائے جائیں گے؟) یہ لوٹایا جاتا تو بہت بعید ہے۔ (ق 50:3-2)

کیا لوگوں کو اس بات پر حیرانی ہے کہ ہم نے انہی میں سے ایک شخص پر وحی کی کہ لوگوں کو ہوشیار کر دو اور اہل ایمان کو بشارت پہنچا دو کہ ان کے لیے ان کے رب کے پاس بڑا مرتبہ ہے؟ کافروں نے کہا : بے شک یہ ایک کھلا ہوا جادوگر ہے۔ (یونس 2:10)

اور یہ کہتے ہیں کہ کیا جب ہم ہڈیاں اور ریزہ ریزہ ہو جائیں گے تو ہم ازسرنو اٹھائے جائیں گے؟ کہہ دو کہ تم پتھر یا لوہا بن جاؤ یا کوئی اور شے جو تمھارے خیال میں ان سے بھی سخت ہو۔ پھر وہ کہیں گے کہ ہمیں کون دوبارہ زندہ کرے گا؟ کہہ دو کہ وہی جس نے تم کو پہلی بار پیدا کیا۔ (اسراء 1749-51:)

اور کہتے تھے کہ کیا جب ہم مر جائیں گے اور مٹی اور ہڈیاں بن جائیں گے تو کیا ازسرنو زندہ کر کے اٹھائے جائیں گے؟ اور کیا ہمارے اگلے آباؤ اجداد بھی؟ (واقعہ 48-5647:)

اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ وہ نشانیاں بیان کرتے ہیں جن کا اوپر ذکر ہوا۔ مثلاً مردہ زمین کی زندگی کے حوالے سے قرآن کریم اس طرح توجہ دلاتا ہے۔

اور وہی ہے جو ابر رحمت سے پہلے ہواؤں کو بشارت بنا کر بھیجتا ہے، یہاں تک کہ جب وہ بوجھل بادل کو اٹھا لیتی ہیں، ہم اس کو ہانکتے ہیں کسی بے آب و گیاہ زمین کی طرف اور وہاں پانی برساتے ہیں اور پھر ہم اس سے پیدا کرتے ہیں ہر قسم کے پھل۔ اسی طرح ہم مردوں کو اٹھا کھڑا کریں گے تا کہ تم یاد دہانی حاصل کرو۔ (اعراف 57:7)

اور تم زمین کو بالکل خشک دیکھتے ہو تو جب ہم اس پر پانی برسا دیتے ہیں تو وہ لہریں لینے لگتی اور اپھتی ہے اور طرح طرح کی خوشنما چیزیں اگاتی ہے۔ یہ سب کچھ اس لیے ہے کہ اللہ ہی پرودگارِ حقیقی ہے اور وہی مردوں کو ایک دن زندہ کر کے اٹھائے گا جو قبروں میں ہیں۔ (حج 5-6:22)

اور ہم نے آسمان سے بابرکت پانی برسایا جس سے ہم نے باغ بھی اگائے اور کاٹی جانے والی فصلیں بھی۔ اور کھجوروں کے بلند و بالا درخت بھی جن میں تہ بہ تہ خوشے لگتے ہیں۔ بندوں کی روزی کے لیے۔ اور ہم نے اس سے مردہ زمین کو زندہ کر دیا۔ اسی طرح (مرنے کے بعد زمین سے) نکلنا بھی ہوگا۔ (ق 9-11:50)

انسانی نیند کو بطور نشانی اس طرح پیش کیا جاتا ہے:

اللہ ہی وفات دیتا ہے جانوں کو ان کی موت کے وقت، اور جن کی موت نہیں آئی ہوئی ہوتی ہے ان کو بھی ان کی نیند کی حالت میں۔ تو جن کی موت کا فیصلہ کر چکا ہوتا ہے ان کو تو روک لیتا ہے اور دوسروں کو ایک وقت مقرر تک کے لیے رہائی دیتا ہے۔ بے شک اس کے اندر نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو غور کرتے ہیں۔ (زمر 42:39)

اجرام فلکی کے طلوع و غروب سے وہ حیات بعد از ممات پر اس طرح استدلال کرتا ہے۔

''(یہ سمجھتے ہیں کہ ہم اِنھیں دوبارہ پیدا نہ کر سکیں گے)؟ نہیں، میں قسم کھاتا ہوں اُس کی جو تمام مشرقوں اور مغربوں کا مالک ہے۔ ہم اِس پر قادر ہیں کہ اِن کو (دوبارہ) اِن سے بہتر پیدا کر دیں اور ہم اِس سے عاجز نہ رہیں گے۔'' (معارج 70:41-40)

خیال رہے کہ یہاں مشارق و مغارب کی قسم کھائی گئی ہے۔ اجرام فلکی مشرق و مغرب ہی میں ڈوبتے اور نکلتے ہیں۔ نیز مشرق یا مغرب کی کوئی ایک جگہ متعین نہیں ہوتی بلکہ مشرق اور مغرب کے تمام اطراف میں یہ طلوع غروب ہوتا ہے اس لیے مشرق و مغرب کے لیے جمع کے صیغے لائے گئے ہیں۔ پھر ان سے یہ استدلال کیا گیا ہے کہ ہم ان انسانوں کو نہ صرف ان جیسا بلکہ ان سے بہتر بنا کر زندہ کرنے کی قدرت رکھتے ہیں۔

اصحاب کہف کا واقعہ اس طرح بیان ہوا ہے۔

''کیا تم نے کہف و رقیم والوں کو ہماری نشانیوں میں سے کچھ بہت عجیب خیال کیا!۔ جب کہ کچھ نوجوانوں نے غار میں پناہ لی اور دعا کی کہ اے ہمارے رب ہمیں اپنے پاس سے رحمت بخش اور ہمارے اس معاملے میں ہمارے لیے رہنمائی کا سامان فرما۔ تو ہم نے غار میں ان کے کانوں پر کئی برس کے لیے تھپک دیا۔ پھر ہم نے ان کو بیدار کیا کہ دیکھیں دونوں گروہوں میں سے کون مدت قیام کو زیادہ صحیح شمار میں رکھنے والا نکلتا ہے۔ ہم تمہیں ان کی سرگزشت ٹھیک ٹھیک سناتے ہیں۔ یہ کچھ نوجوان تھے جو اپنے رب پر ایمان لائے اور ہم نے ان کی ہدایت میں مزید افزونی عطا فرمائی۔ اور ہم نے ان کے دلوں کو مضبوط کیا جب کہ وہ اٹھے اور کہا

کہ ہمارا رب وہی ہے جو آسمانوں اور زمین کا رب ہے۔ ہم اس کے سوا کسی اور معبود کو ہرگز نہیں پکاریں گے۔ اگر ہم نے ایسا کیا تو ہم یہ حق سے نہایت ہی ہٹی ہوئی بات کہیں گے۔ یہ ہماری قوم کے لوگوں نے اس کے سوا کچھ دوسرے معبود بنا رکھے ہیں۔ یہ ان کے حق میں واضح دلیل کیوں نہیں پیش کرتے! تو ان سے بڑا ظالم کون ہوگا جو خدا پر جھوٹ باندھیں۔ اور اب کہ تم ان کو اور ان کے معبودوں کو، جن کو وہ خدا کے سوا پوجتے ہیں، چھوڑ کر الگ ہو گئے ہو تو غار میں پناہ لو، تمہارا رب تمہارے لیے اپنا دامن رحمت پھیلائے گا اور تمہارے اس مرحلہ میں تمہاری ضروریات کا سامان مہیا فرمائے گا۔ اور تم دیکھتے سورج کو کہ جب طلوع ہوتا ہے تو ان کے غار سے دائیں جانب کو بچا رہتا ہے اور جب ڈوبتا ہے تو ان سے بائیں طرف کو کترا جاتا ہے اور وہ اس کے صحن میں ہیں۔ یہ اللہ کی نشانیوں میں سے ہے۔ جس کو اللہ ہدایت دے وہی راہ یاب ہوتا ہے اور جس کو وہ گمراہ کر دے تو تم اس کے لیے کوئی دستگیری کرنے والا اور رہنمائی کرنے والا نہیں پا سکتے۔

اور تم ان کو جاگتا گمان کرتے حالانکہ وہ سو رہے ہوتے اور ہم ان کو داہنے بائیں کروٹیں بھی بدلواتے اور ان کا کتا دونوں ہاتھ پھیلائے دہلیز پر ہوتا، اگر تمہاری نظر ان پر پڑ جاتی تو تم وہاں سے الٹے پاؤں بھاگ کھڑے ہوتے اور تمہارے اندر ان کی دہشت سما جاتی۔

اور اسی طرح ہم نے ان کو جگایا کہ وہ آپس میں پوچھ گچھ کریں۔ ان میں سے ایک پوچھنے والے نے پوچھا، تم یہاں کتنا ٹھہرے ہو گے؟ وہ بولے ہم ایک دن یا ایک دن سے بھی کم ٹھہرے ہوں گے۔ بولے تمہاری مدت قیام کو تمہارا رب ہی بہتر جانتا ہے۔ پس اپنے میں سے کسی کو اپنی یہ رقم دے کر شہر بھیجو تو وہ اچھی طرح دیکھ لے کہ شہر کے کس حصہ میں پاکیزہ کھانا ملتا ہے اور وہاں سے تمہارے لیے کچھ کھانا لائے اور چاہیے کہ وہ دبے پاؤں جائے اور کسی کو تمہاری خبر نہ ہونے دے۔ اگر وہ تمہاری خبر پا جائیں گے تو تمہیں سنگسار کر دیں گے یا تمہیں اپنی ملت میں لوٹا لیں گے اور پھر تم کبھی فلاح نہ پا سکو گے۔ اور اسی طرح ہم نے ان لوگوں کو مطلع کر دیا تاکہ لوگ جان لیں کہ اللہ کا وعدہ شدنی ہے اور قیامت کے آنے میں کوئی شبہ نہیں ہے۔ (کہف 18:21-9)

[جاری ہے]

فرح رضوان

بچوں کی تربیت کے کچھ اصول (۱)

رنگ ونسل کے علاوہ انسان کواس کے احساسات ، جذبات اور رویے دوسروں سے ممتاز کرتے ہیں.

انہی احساسات میں ایک چھٹی حس بھی ہے، جواگر بروقت کام آجائےتو قدرت کا عطیہ اور انعام ہے۔لیکن اس کا بے وقت ، بے دھڑک اور بے سبب استعمال خودکوانزا یٹی ،اور آپ سے منسلک افرادخانہ کوذہنی کوفت کے گڑھے میں دھکیل دیتا ہے -انتہا سے زیادہ احساس ذمہ داری کے مارے والدین، وقت سے آگے دوڑنے کی کوشش میں اس دہشت زدہ ہرنی کی طرح لگنے لگتے ہیں، جوابھی ابھی دشت تنہائی میں چیتے سے شرف ملاقات حاصل کر کے آئی ہو۔جبکہ کچھ والدین گاندھی جی کے بندروں سے بہت متاثرنظر آتے ہیں،یعنی "اپنی اولادکو "برا نہ کہو، برا نہیں دیکھو برا نہ سنو۔جب کہ ان کےنورچشم ،ڈارون کی تھیوری کوخراج تحسین پیش کرتے ، بلکہ اس پرٹھوس دلائل اورثبوت پیش کرتے دکھائی دیں گے۔

ایسے بچے عموماً کھلونوں سے کھیلنے کے بجائے،انہیں کھولنے پرتوجہ مرکوز رکھتے ہیں. ان کی دلچسپی صوفوں پر بیٹھنے کے بجائے ،انہیں بے دریغ جمپنگ کیسل کے طور پراستعمال کرنے میں ہوتی ہے .یقیناً اس میں سراسر والدین کاقصور ہوتا ہے۔پہلی غلطی تو وہ یہ کرتے ہیں، کہ ہمیشہ اس خوش فہمی میں رہتے ہیں، کہ بڑاہوکرسیکھ جائے گا،دوسری یہ کہ ٹوکنے یاسمجھانے والوں سے ہمیشہ غلط فہمی میں مبتلا رہتے ہیں۔

اگر مالی طور پر دوسروں سے بہتر ہیں تو گمان رہتا ہے کہ لوگ ان سے جلتے،حسد کرتے ہیں۔اوراگردنیاوی لحاظ سے کم ہیں تو انتہائی یاسیت میں گرفتار ہوجاتے ہیں۔

کچھ والدین کے نزدیک صرف اچھے گریڈز لانے والا بچہ ہی ہیرو ہوتا ہے، اور وہ ہمیشہ اپنے بچوں کو اس کا طعنہ دیتے رہتے ہیں۔ ان کا گمان ہوتا ہے کہ اس طرح بچوں میں مسابقت کا جذبہ پیدا ہوگا، لیکن! ان میں احساس کمتری یا رقابت کے سوا کچھ جنم نہیں لیتا اور شیطان تو ہر ایک کے ساتھ ہے اس لیے اکثر بچے جو باقی باتوں میں بہت بہتر ہوتے ہیں، بے قدری اور مایوسی کی وجہ سے ضد اور خودسری میں جائے پناہ ڈھونڈتے ہیں۔

ایک ہی والدین کا ہر بچہ مختلف ہوتا ہے ،سب کو ایک لاٹھی سے ہانکنا عقلمندی کا سودا نہیں، ہمارا دین اعتدال کی تلقین کرتا ہے، پیار یا سزا، امید یا خوف، کب کس کے لیے کتنا ہونا چاہیے، والدین کو اس کے لیے ہر وقت دعا اور نوافل کا اہتمام کرنا چاہیے۔ کیونکہ ہر ایک کا دل اللہ کے ہاتھ میں ہے ہر ایک کا ذہن ماحول اور مستقبل بنانے والا وہی ہے رزق وصلاحیت عطا کرنے والا وہی ہے، اس لیے اس سے بنا کر رکھنے کی ضرورت ہے۔

بچے کی پیدائش پر اس کے ایک کان میں اذان دوسرے میں اقامت تو ہم دے دیتے ہیں لیکن عموماً صف بندی میں کوتاہی کر بیٹھتے ہیں۔ ہم میں سے اکثر خود کو امام کا رتبہ تو دیتے ہیں لیکن نیتیں درست نہیں کر پاتے خود اللہ کے احکامات کی پابندی نہیں کرتے اور بچوں سے گلہ کہ سنتے نہیں ہیں، حکم عدولی کرتے ہیں.

[جاری ہے]

بس آپ امید کی شاہراہ کو اختیار کرلیجیے
کامیابی کا ہر راستہ اسی راہ سے نکلتا ہے (ابویحییٰ)

ریاض احمد سید

کیا آپ کو اپنے بچوں کی پروا ہے؟

ماشاء اللہ آپ بال بچوں والے ہوں گے۔ ہوسکتا ہے آپ کے دو ہتے پوتے بھی ہوں۔ فرشتوں جیسے معصوم بچے جن کی پرورش کسی زمانے میں نہایت لاڈ پیار اور احتیاط کے ساتھ ہوتی تھی۔ مشترکہ خاندانی نظام برقرار تھا اور دیکھنے والی بہت سی آنکھیں اردگرد ہوا کرتی تھیں۔ مگر جب سے جدیدیت در آئی ہے اور اپنی زندگی خود سے جینے کا رواج ہوا ہے، کسی قسم کی روک ٹوک اور مداخلت کے بغیر۔ تو وہ جو کہتے ہیں نا، کہ کچھ پانے کے لیے کچھ کھونا پڑتا ہے۔ ایسے جوڑوں کو پرائیویسی تو شاید مل گئی ہو، مگر اس کی جو قیمت چکانا پڑ رہی ہے، اس کا شاید انہیں ٹھیک سے ادراک نہیں ہوتا اور جب ہوتا ہے تو پانی سر سے گزر چکا ہوتا ہے۔ ''میں تے تیرا ڈھولن ماہی'' قسم کی فیملی میں جب بچہ تشریف لاتا ہے، تو اسٹیٹس بلند کرنے کی دوڑ میں شریک ملازمت پیشہ جوڑے کے پاس اس کے علاوہ کوئی آپشن نہیں ہوتا کہ اس کی نگہداشت کے لیے کوئی ٹین ایج لڑکا/لڑکی ملازم رکھ لیں۔ یہ ملازم لوگ باقی تو جو بھی کرتے ہوں گے، راقم کو اس سے سروکار نہیں۔ البتہ سب سے بڑا ظلم بچے کے ساتھ یہ کرتے ہیں کہ سارا سارا دن معصوم کو ٹی وی کے سامنے لٹائے یا بٹھائے رکھتے ہیں۔ کیونکہ خود ٹی وی میں جان پھنسی ہوتی ہے اور بچے کو مصروف کرنے کا اس سے بہتر طریقہ اور کوئی نہیں۔ اب ان کا کام صرف یہ رہ جاتا ہے کہ بھوک لگی تو منہ میں فیڈر دے دیا، یا ضرورت ہوئی تو پیمپر بدل دیا۔ ان کے ساتھ کھیل کود، بات چیت اور زبانی ابلاغ کا سلسلہ بالکل بند۔ نتیجہ کیا ہوتا ہے؟ راقم نے ایسے کئی بچوں کو ذہنی طور پر مفلوج ہوتے ہوئے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ جو نہ صرف بول نہیں سکتے۔ بات سمجھنے میں بھی دشواری محسوس کرتے ہیں۔ والدین کو اول تو پتہ ہی نہیں چلتا، جب چلتا ہے تو دیر ہو چکی ہوتی ہے، اور ان

معصوم جانوں کا نارمل زندگی کی طرف لوٹنا مشکل ہی نہیں، بعض اوقات ناممکن بھی ہوجاتا ہے۔

یہ مسئلہ ہمارے ہاں ہی نہیں۔ امریکہ جیسے ترقی یافتہ ملک میں بھی ایک عذاب کی صورت میں سامنے آیا ہے۔ جس پر غور و فکر کے لیے چند برس پہلے بچوں کے امراض کے ماہرین بوسٹن میں سر جوڑ کر بیٹھے تھے، اور سب کی متفقہ رائے تھی کہ اگر آپ بچے کے ذہن کی صحیح نشو نما چاہتے ہیں تو ٹی۔ وی کا پلگ نکال دیں اور گرد و پیش سے ہر قسم کی سکرین ہٹا دیں۔ خاص طور پر دو برس سے کم عمر کے بچوں کے لیے تو یہ سب زہر قاتل سے کم نہیں۔ چیختی چنگھاڑتی اسکرینوں کے رحم و کرم پر چھوڑنے کی بجائے ان کے ساتھ کھیلیں، چھوٹی چھوٹی باتیں کریں اور ان کے تجسس کا نوٹس لیں۔ منہ سے ادا ہونے والے الفاظ سے بچہ جس تیزی کے ساتھ سیکھتا ہے، اس کا آپ اندازہ نہیں کر سکتے۔ اسکرین سے برآمد ہونے والی آوازیں اس کے ذہن کی اسکرین کو دھندلا جاتی ہیں اور وہ کنفیوژن کا شکار ہوجاتا ہے جس کی وجہ سے اسکولنگ میں تاخیر ہی نہیں ہوتی ہے، بلکہ یہ کمی کوتاہی زندگی بھر اس کے ساتھ چلتی ہے''

دوسرا ظلم بچوں کے ساتھ ان کی جسمانی صحت کے حوالے سے ہو رہا ہے۔ بعض ماؤں کے پاس تو واقعی وقت نہیں ہوتا اور بعض محض فیشن کے طور پر کچن سے پرہیز کرتی ہیں۔ نتیجہ یہ کہ بچوں کو باہر کا کھانے کی لت پڑتی ہے۔ جو بچوں کی اشیائے خورد و نوش کے ملٹی بلین انڈسٹری کی صورت میں ہمارے سامنے ہے۔ بازار میں ایسے ایسے چٹخارے دار آئٹم میسر ہیں کہ سال بھر کا بچہ بھی ان کا گرویدہ ہوجاتا ہے اور اس الم غلم کے علاوہ اس کے گلے سے کوئی چیز نیچے نہیں اترتی۔ یہ ایک خطرناک رجحان ہے۔ بے پناہ چینی، نمک، گھی، چربی اور کیمیکلز اور خوش نما رنگوں کا ملغوبہ اشیائے خورد و نوش بچوں کے لیے زہر سے بڑھ کر ہیں۔ غذا کے نام پر لی جانے والی ان اشیاء میں غذائیت نام کی کوئی چیز نہیں ہوتی۔ البتہ انہیں بیماریوں کی پوٹلی ضرور کہا جا سکتا ہے۔ ترقی یافتہ

دنیا اسے جنک فوڈ کے نام سے یاد کرتی ہے جس کا سیلاب کوئی بچاس برس پہلے مغرب سے ہی امڈا تھا۔ مگر اب وہ سیانے ہو چکے ہیں اور جنک فوڈ سے تائب بھی۔ اور ہم ہیں کہ اسے اسٹیٹس سمبل بنا کر اپنی آنے والی نسلوں کی تباہی کا سامان بدستور کیے جا رہے ہیں۔ یاد رکھیں کہ جسمانی مشقت سے محروم بچے الم غلم کھا کر ایک بار بدوضع ہو گئے تو زندگی بھر سمارٹ ہونے کا خواب شرمندہ تعبیر نہ ہو سکے گا۔ گول مٹول بچپن تو اچھا لگتا ہے، مگر پھولی پھولی سی جوانی سے گھن آتی ہے اور رہا بڑھاپا تو اس کا تو تصور ہی روح فرسا ہے۔ بڑھاپے میں اگر توانا ورفٹ رہنا مقصود ہو تو اس کی تیاری بچپن سے کرنا ہوتی ہے بدقسمتی سے اسکولوں میں کھیل کے میدان نہ رہے اور یوں بچوں میں کاہلی در آئی۔ رہی سہی کسر سیل فونز اور کمپیوٹر ایکٹیویٹی نے نکال دی۔

الحمدللہ، ہماری نسل کا بڑھاپا نسبتاً خوشگوار ہے، کیونکہ ہم نے ایکڑوں میں پھیلے وسیع وعریض گراؤنڈز والے اسکولوں میں تعلیم پائی تھی۔ گاڑیوں کا سیلاب ابھی نہیں آیا تھا۔ سوسائیکل بھی چلاتے تھے اور پیدل بھی چلتے تھے۔ ملازمین کے ہوتے ہوئے بھی ہاتھ پاؤں ہلانے کی عادت ڈالی جاتی تھی۔ دس دس مرلے والے ڈربہ نما، مگر بڑے ناموں والے اسکولوں میں پڑھنے والے، گاڑی سے پاؤں نیچے نہ رکھنے والے، اور بات بات پر ملازم کو آواز دینے والے جدید نونہالوں کے مستقبل کا تصور کر کے ہول اٹھتا ہے۔ ماں باپ کو اولاد سے یقیناً محبت ہوتی ہے، اگر وہ ان کا بھلا چاہتے ہیں تو انہیں اس جعلی ماحول سے نکالیں۔ اسکولوں میں انتظام نہیں تو باہر میدانوں میں کھیلنے کے لیے بھیجیں۔ کم از کم سڑک پر سو، پچاس میٹر کی دوڑ ہی لگوا دیا کریں۔ انہیں گھر کا چھوٹا موٹا کھانے کی عادت ڈالیں اور قطار میں لگ کر جنک فوڈ خریدنے کے فیشن کے چکر سے نکالیں۔ اپنی چیزیں خود سنبھالنے اور اپنا کام خود کرنے کا عادی بنائیں۔ ورنہ بڑھاپا تو ظالم ہوتا ہی ہے۔ اپنے وقت کے عظیم ویٹ لفٹر اور 1956 کے اولمپکس کے رنر اپ جوئے سارٹر

کچھ عرصے پہلے سپر مارکیٹ سے پانچ لٹر آئل کا ڈبہ اٹھا کر گاڑی تک لائے، تو کندھے کا جوڑ اپنی جگہ سے کھسک گیا۔ رستم زماں کی شہرت رکھنے والے نامی گرامی پہلوان، اکھاڑے میں کسرت کرتے ہوئے نو آموز پہلوان کے ڈنٹر پیلنے کے انداز سے غیر مطمئن ہوا، تو خود کر کے دکھانے کی ٹھانی، اور تیسرے ہی ڈنٹر میں زمین سے اٹھ نہ پایا تھا۔

آج کی مائیں کچھ زیادہ ہی ماڈرن اور مصروف ہیں۔ بچوں کو ملازموں کے رحم و کرم پر چھوڑنے کو اسٹیٹس سمبل خیال کرتی ہیں۔ شاید ان کے علم میں نہیں کہ امریکہ کی خاتون اول مشعل اوباما جب وائٹ ہاؤس منتقل ہوئیں تو سرکاری و سماجی تقریبات میں کم کم دکھائی دیتی تھیں۔ کسی نے پوچھا تو محترمہ کا جواب تھا کہ میری دونوں صاحبزادیاں اسپریشل ایبل ایج میں ہیں۔ ایک دس اور دوسری سات برس کی ۔ وہ اس وقت میری اولین ترجیح ہیں، آج کل میں مام انچیف Mom-in-chief کا کردار نبھا رہی ہوں۔ اور قوم کے بچوں سے رغبت کا یہ عالم کہ ان میں بڑھتی ہوئی فربہی نے ان کی نیندیں اڑا دی تھیں اور بنفس نفیس "بچوں میں موٹاپے" کے خلاف ملک گیر تحریک کی قیادت کی۔ بچوں میں تازہ اور صحت بخش غذا کا تصور اجاگر کرنے کی غرض سے وائٹ ہاؤس کے جنوبی لان میں سبزیوں کے لیے ایک قطعہ زمین تیار کرایا۔ جہاں سبزیوں کی کاشت اور دیکھ بھال کے لیے اسکول کے بچوں کو دعوت دی جاتی ہے اور وہ منظر دیکھنے کے لائق ہوتا ہے جب وہ اسکول یونیفارم میں ملبوس بچے وائٹ ہاؤس کے لان میں اپنے اگائے ہوئے آلوؤں اور ٹماٹروں کی دعوت اڑاتے ہیں۔

> منفی انسان کو ہر موقع میں ایک مشکل نظر آتی ہے
> مثبت انسان ہر مشکل میں ایک موقع دیکھتا ہے (ابو یحییٰ)

پروفیسر محمد عقیل

پریشان ہونا چھوڑیئے، جینا شروع کیجئے

اصول نمبر 12۔ برائی کا جواب برائی سے دینے کی قیمت

کیس اسٹڈی

وہ آج دفتر میں داخل ہوا تو چپراسی نے کہا کہ صاحب یاد کررہے ہیں۔ وہ آلتو جلالتو پڑھتا ہوا باس کے کمرے میں داخل ہوا۔ باس کا موڈ ٹھیک نہ تھا۔ " تمھیں پتا ہے تم نے فراڈ کیا ہے؟ باس مخاطب ہوا لیکن اس کی نگاہیں بتارہی تھیں کہ وہ اپنا جھوٹ چھپانے کی کوشش کررہا ہے۔

اس نے فراڈ کا انکار کیا لیکن اس ملاقات کا انجام اس کی ملازمت برطرفی پر ہوا اور یوں باس نے اپنے دیرینہ انتقام کو پورا کرلیا۔ وہ منہ لٹکائے گھر واپس آ گیا۔ باس کی شکل اسے دنیا کے قبیح ترین جانور سے ملتی جلتی نظر آرہی تھی، اندر غم و غصے کا ایک طوفان برپا تھا۔ ایک طرف بے روزگاری کا غم تو دوسری طرف انتقام لینے کی شدید خواہش۔ وہ اپنے ایک جاننے والے کے پاس پہنچا جو ایک پیشہ ور قاتل تھا۔ اس نے سارا کیس اس کے سامنے رکھ دیا۔

" مجھے ہر صورت میں باس کی لاش چاہئے اس کے بعد تم جو بولو گے ہو جائے گا۔ "اس نے اپنے جاننے والے پیشہ ور قاتل سے کہا۔ اس نے جواب دیا کہ تم ابھی جاو اور ایک مرتبہ پھر سوچ لو۔ کل بات کریں گے۔ وہ واپس تو آ گیا لیکن اس یقین کے ساتھ کہ کل بھی وہ یہی کہے گا اور باس کا خون کرواکے ہی دم لے گا۔

رات کو جب سونے کے لئے لیٹا تو نیند کوسوں دور تھی۔ اس نے دو نیند کی گولیاں پھانکیں اور سونے کے لئے لیٹ گیا۔ آنکھیں بند ہونے کے باوجود اس کا لاشعور اسے وہی دکھاتا رہا۔ اس کے سامنے اس کے باس کی لاش پڑی ہے اور اس کے سینے پر پاؤں رکھ کر وہ قہقہے لگا رہا ہے۔ پھر منظر بدلتا ہے۔ اس کا دوست اس سے اس سے قتل کی قیمت وصول کرنے آ جاتا ہے۔ یہ قیمت

پیسوں سے نہیں بلکہ ٹارگٹ کلر بن کر ہی چکائی جاسکتی تھی۔ یوں وہ ایک ٹارگٹ کلر بن کر لوگوں کا خون کرنا شروع ہی کرتا ہے کہ اچانک اس کی آنکھ کھل جاتی ہے۔ وہ منہ دھو کر اٹھتا ہے اور اب اس کا رخ اپنے دوست کی جانب نہیں بلکہ نئی ملازمت کی تلاش کی طرف تھا۔ اس نے انتقام کی مہنگی قیمت چکانے کی بجائے اس واقعے کو فراموش کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

وضاحت

یہ ایک حقیقت ہے کہ یہ دنیا ہم نے نہیں بنائی۔ اسی لئے یہاں ہر روز ایسے واقعات درپیش ہوتے ہیں کہ جن میں ہمیں لوگوں سے شکایت ہوتی ہے۔ اس بات سے قطع نظر کہ یہ شکایت جائز ہے یا ناجائز، ہم اپنے مخالفین سے نفرت کرتے ہیں۔ ہماری نفرت ہمارے دشمنوں کو وہ قوت فراہم کرتی ہے جس سے وہ باآسانی ہم پر غلبہ پاسکتے ہیں۔ اگر ہمارے دشمنوں کو یہ بات پتا چل جائے کہ ہم کس قدر پریشان ہیں تو وہ خوشی سے بھنگڑا ڈالنا شروع کر دیں۔ ہماری نفرت، پریشانی، لعنت ملامت اور حسد سے دشمنوں کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا بلکہ ہماری اپنی زندگی جہنم بن جاتی ہے۔

اس کا حل یہ ہے کہ ہم اپنے دشمنوں سے پیار کریں اس لئے نہیں کہ واقعی ہمیں ان سے پیار ہے بلکہ اس لئے کہ ہمیں اپنے آپ سے پیار ہے۔ دشمنوں سے انتقام لینے کی قیمت دینے کی بجائے دشمنوں کو معاف کر دیں اور ناخوشگوار واقعے کو بھول جائیں۔ اگر یہ نہیں کر سکتے تو انتقام کی قیمت چکانے کے لئے تیار ہو جائیں۔

اسائنمنٹ

۔اپنے مخالفین کی فہرست بنایئے اور اختلاف کی وجہ بھی لکھیں۔

۔یہ لکھیں کہ اگر آپ بدلہ لیں گے تو اس کی قیمت کیا ہوگی؟

۔فراموش کرنے کی عادت ڈالیں کیونکہ آپ اپنے دشمن نہیں دوست ہیں۔

مبشر نذیر

ترکی کا سفرنامہ (15)

اصل میں جب انسان دین کی طرف مائل ہوتا ہے تو اس میں کچھ ایسا جوش پیدا ہو جاتا ہے کہ اسے دین کے اصل احکام کافی نہیں لگتے۔ ایک صاحب نظر نے اس کیفیت کا تجزیہ کچھ یوں کیا ہے:

انسان کے اندر یہ عام کمزوری پائی جاتی ہے کہ جن چیزوں کے ساتھ اس کا تعلق محض عقلی ہی نہیں بلکہ جذباتی بھی ہوتا ہے، ان معاملات میں وہ بسا اوقات غیر متوازن اور غیر معتدل ہو جایا کرتا ہے۔ آدمی اپنے بیوی بچوں سے محبت کرتا ہے تو صرف محبت ہی نہیں کرتا بلکہ بسا اوقات اس محبت میں وہ ایسا اندھا ہو جاتا ہے کہ دوسروں کے ساتھ عداوت بھی کرنے لگتا ہے یہاں تک کہ اس اندھے پن میں اس کو خدا کے حقوق کا بھی کچھ ہوش نہیں رہ جاتا۔ اگر اسے اپنے قبیلہ یا قوم یا ملک سے محبت ہے تو ان کی عصبیت اس پر بسا اوقات اتنی غالب آ جاتی ہے کہ وہ ان کے لئے پوری انسانیت کا دشمن بن جاتا ہے۔ حد یہ ہے کہ ان کی حمایت میں خود خدا سے بھی لڑنے کے لئے اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔

یہی چیز مذہب کے دائرہ میں آ کر اور زیادہ نمایاں ہو جاتی ہے کیونکہ مذہب کے ساتھ اولاً تو عام لوگوں کا تعلق عقلی کم اور جذباتی زیادہ ہوتا ہے اور اگر عقلی ہوتا بھی ہے تو بھی اس معاملے میں انسان کے جذبات اتنے شدید ہوتے ہیں کہ عقل کے لئے ان کو ضبط میں رکھنا آسان کام نہیں ہوتا۔ یہ جام و سنداں کی بازی کھیلنا ہر شخص کے بس کا کام نہیں ہے۔ چنانچہ اس دائرہ کے اندر ایسا بہت ہوتا ہے کہ آدمی کو جس حد پر رک جانا چاہیے، وہاں آ کر وہ نہیں رکتا بلکہ اس کو پھلانگ کر آگے نکل جانا چاہتا ہے۔

اگر ایک شخص اس کا مرشد ہے تو وہ اس کو مرشد ہی کے درجہ پر نہیں رکھے گا بلکہ اس کی خواہش یہ ہوگی کہ وہ کسی طرح اس کو رسالت کے مرتبہ پر فائز کردے۔ اسی طرح اگر ایک ذات کو خدا نے منصب رسالت سے سرفراز فرمایا ہے تو یہ اپنے جوش عقیدت میں یہ چاہے گا کہ اس کو خدا کی صفات میں بھی کچھ نہ کچھ شریک کردے۔ اگر اس سے کسی کام کا مطالبہ پاؤ کیا گیا ہے تو وہ چاہے گا کہ وہ اس کو بڑھا کر سیر بھر کردے۔ اس غلو پسندی نے دنیا میں بڑی بڑی بدعتوں کی بنیادیں ڈالی ہیں۔ اسی کے سبب سے عیسائیوں نے حضرت مسیح علیہ السلام کو خدا کا بیٹا بنایا۔ اسی کے سبب سے انہوں نے اپنے صوفیوں اور عالموں کو اربابا من دون اللہ (اللہ کے علاوہ رب) کا درجہ دیا اور یہی چیز تھی جس نے ان کو رہبانیت کے فتنہ میں مبتلا کیا۔۔۔۔

بدعت کا دوسرا سبب خواہشات نفس کی پیروی ہے۔ انسان کے اندر یہ بھی ایک کمزوری ہے کہ بسا اوقات وہ ایک نظریہ یا ایک رویہ اختیار تو اس وجہ سے کرتا ہے کہ وہ اس کی خواہشات نفس کے مطابق ہوتا ہے۔ اس سے اس کے کسی مخفی منصوبے کی تکمیل ہو رہی ہوتی ہے۔ اس سے کسی ایسے شخص کی خوشنودی اسے حاصل ہوتی ہے جس کی خوشنودی اسے اپنے دنیوی اغراض کے نقطہ نظر سے مطلوب ہوتی ہے۔ اس سے اس کے وہ ارمان پورے ہوتے ہیں جو نفس کی اکساہٹ سے اس کے اندر ہر وقت گدگدیاں پیدا کر رہے ہوتے ہیں لیکن وہ اتنی جرأت و ہمت نہیں رکھتا کہ ان چیزوں کی تکمیل کے لئے وہ صاف صاف نفس پرستی اور دنیا پرستی کے نام سے میدان میں اترے بلکہ وہ چاہتا ہے کہ اپنی اس دنیا داری اور نفس پرستی کے لئے دین داری کی کوئی آڑ بھی تلاش کرے تاکہ رند کا رند بھی رہ سکے اور ہاتھ سے جنت نہ جانے پائے۔

اس خواہش کے تحت وہ مختلف قسم کے نظریات بناتا ہے اور ان کو مذہب کے اندر گھسانے کی کوشش کرتا ہے اور اگر گھسانے میں کامیاب ہو جاتا ہے تو پھر ان سے اپنی خواہشوں کے بند

دروازوں کو کھولنے میں کلید کا کام لیتا ہے۔خواہشات نفس کے تحت فتوی لکھتا ہے اوران کو کتاب وسنت کی طرف منسوب کرتا ہے۔بعض سفلی جذبات کی تسکین کے لئے بہت سے کام کرتا ہے اور ان کو معرفت الٰہی اورتقرب الی اللہ کا ذریعہ بتا تا ہے۔(امین احسن اصلاحی،تزکیہ نفس)

نماز سے فارغ ہو کر میں امام صاحب سے ملاقات کے لئے آگے بڑھا۔میں نے بیک وقت انگریزی اور عربی میں گفتگو کا آغاز کیا۔انہیں دونوں زبانوں سے واقفیت نہ تھی۔انہوں نے نائب امام کو بلایا اور اشارے سے کہا کہ یہ عربی جانتے ہیں۔نائب امام تھوڑی بہت عربی جانتے تھے۔انہوں نے مجھے مسجد کا کتبہ دکھایا جس پر 1499ء کی تاریخ لکھی ہوئی تھی۔بتانے لگے کہ یہ مسجد بولو کے گورنر نے 500 سال پہلے تعمیر کی تھی اور یہ شہر کی مرکزی جامع مسجد تھی۔

پروین سلطانہ حنا

سپردگی

جیون کے بہتے ساگر میں
میں تو اپنی عمر کی ناؤ
مالک تجھ کو سونپ رہی ہوں
تیز ہوائیں تیرے تابع
موجیں تیری، رستے تیرے
جس سمت چاہے نیّا لے چل
تیری جانب دیکھ رہی ہوں

بھروسہ

خوشی ملی ہے جو یہاں
ترے کرم کی دین ہے
جو دکھ ملے مجھے یہاں
وہ آنسوؤں میں ڈھل گئے
نظر اٹھی تری طرف
دعا کے پھول کِھل گئے
مرے تمام راستے
تری طرف نکل گئے

اللہ تعالیٰ کی پسند و ناپسند کا فیصلہ

"تمھارے رب نے فیصلہ کر دیا ہے کہ:

تم لوگ کسی کی عبادت نہ کرو، مگر صرف اس کی۔

اور والدین کے ساتھ نیک سلوک کرو۔ اگر تمہارے پاس ان میں سے کوئی ایک، یا دونوں، بوڑھے ہوکر رہیں تو انہیں اف تک نہ کہو، نہ انہیں جھڑک کر جواب دو، بلکہ ان سے احترام کے ساتھ بات کرو، اور نرمی و رحم کے ساتھ ان کے سامنے جھک کر رہو، اور دعا کیا کرو کہ 'پروردگار، ان پر رحم فرما جس طرح انہوں نے رحمت و شفقت کے ساتھ مجھے بچپن میں پالا تھا'۔ تمہارا رب خوب جانتا ہے کہ تمہارے دلوں میں کیا ہے۔ اگر تم صالح بن کر رہو تو وہ ایسے سب لوگوں کے لیے درگزر کرنے والا ہے جو اپنے قصور پر متنبہ ہوکر بندگی کے رویے کی طرف پلٹ آئیں۔

اور رشتہ دار کو اس کا حق دو اور مسکین اور مسافر کو اس کا حق۔

اور فضول خرچی نہ کرو۔ فضول خرچ لوگ شیطان کے بھائی ہیں، اور شیطان اپنے رب کا ناشکرا ہے۔

اور اگر ان سے (یعنی حاجت مند رشتہ داروں، مسکینوں اور مسافروں سے) تمہیں کترانا ہو، اس بنا پر کہ ابھی تم اللہ کی اس رحمت کو، جس کے تم امیدوار ہو، تلاش کر رہے ہو تو انہیں نرم جواب دے دو۔

اور نہ تو اپنا ہاتھ گردن سے باندھ رکھو اور نہ اسے بالکل ہی کھلا چھوڑ دو کہ ملامت زدہ اور عاجز بن کر رہ جاؤ۔ تیرا رب جس کے لیے چاہتا ہے رزق کشادہ کرتا ہے اور جس کے لیے چاہتا ہے تنگ کر دیتا ہے۔ وہ اپنے بندوں کے حال سے باخبر ہے اور انہیں دیکھ رہا ہے۔

(بنی اسرائیل 17:30-23)